

پہلاں دے رشتہ

فائزہ افتخار

1urdu.com

saba

www.1urdu.com



1urdu.com

انتساب

اپنی پیاری بیٹی اسو کے نام

UrduPhoto.com

”پچھلاں دے رنگ کالے“ میرے تخلیقی سفر کے ابتدائی دور کی تحریر ہے اور میری پسندیدہ ترین تحریروں میں سے ایک اسی لیے جب ادارہ خواتین ڈائجسٹ نے میری تحریروں کو کتابی شکل میں لانے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے خود اسٹیل کو یہ ناول تجویز کیا۔

اس ناول کے بارے میں ایک دلچسپ بات بتاتی چلوں کہ اس کی کہانی واقعات سب بے شک فرضی ہیں مگر کروار تقریباً "حقیقی"۔ بسم اللہ جان، حضرتی، ڈاکٹر خوشنود، غٹ شنڈے، رحیم گل، ارباب خٹک۔ یہ میرے بچپن کے بہت دیکھے بھالے کروار ہیں جنہیں میں نے اس یقین کے ساتھ اس کہانی میں مدغم کیا ہے کہ یہ ناول ان کی نظموں سے کبھی گزرے گا ہی نہیں۔ ان میں سے بیشتر آئیں اب یاد ہی فینڈ سوچتی ہیں۔

دوسری اہم بات جو اس ناول کو میری نظروں میں اہم بناتی ہے وہ یہ کہ اس سے قبل میں نے کبھی طویل تحریر لکھنے کا حوصلہ نہیں کیا تھا۔ میں طبعاً "ر سکی نہیں ہوں اور کچھ کچھ سل پسند بھی" لیکن اس کمائی نے خود اپنا آپ مجھ سے لکھوایا اور مجھ میں یہ اعتماد بھی پیدا کیا کہ اگر میں چاہوں تو خود چرکا ست اور سل پسند کا ایمل اتار سکتی ہوں۔

اس ناول میں میرا سب سے پسندیدہ کردار "صہبہ" ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس کے کردار کی ان تمام خوبیوں یا خصوصیات کو ٹھیک اس انداز میں قارئین تک پہنچ سکوں جس طرح انہوں نے مجھے متاثر کیا اور لکھنے پر اکسایا۔

مجھ سے کہنے والوں نے اکثر پوچھا ہے کہ میری کہانیوں کا مرکزی کردار زیادہ تر مرد کیوں ہوتا ہے اس سوال کا جواب تو مجھے بھی نہیں معلوم البتہ اتنا ضرور ہے کہ میں نے ایسا کبھی ارادہ کیا۔

یہ سچ ہے کہ میرے تخلیق کردہ کرداروں میں سب سے مضبوط اور تاثیر انگیز کردار وہ ہوتے ہیں اور ان
بہت سے کرداروں میں سے ایک ”کاشمیر ملک“ ہے۔ ”سارے گلاب لے جایا“ کا کاشمیر ملک۔

عاشق کوئی ماورائی کردار نہیں ہے، نہ ہی کوئی مثالی مرد ہے وہ اس معاشرے کا ایک عام مرد ہے۔ بہت سی فہانت و جاہلت، کشش کے ساتھ ہی روایتی فہلستکو رکھنے والا ایک مرد جو اپنے سے آگے کسی کو دیکھ نہیں سکتا، بالخصوص کسی عورت کو۔ جو رقابت کی آگ میں اپنے سبکے رشتوں کو بھی جھونک دیتا ہے۔

ایسا مرد جو عورت کی کسی لغزش کو معاف کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ ایسا مرد جو بدلتی ہوئی عورت کے بارے میں وہی فرسودہ نظریہ رکھتا ہے لیکن اس بہت عام سے مرد کے اندر کہیں ایک بہت خاص بات بھی موجود ہے جسے میں نے ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

اور یہی عام سے خاص اور خاص سے خاص تر بننے کا کیسیا ہے۔ یعنی خود احتسابی کا عمل اس عمل سے گزر کے ہی حاشر ملک میری کہانی کا ہیرو بنا ورنہ ابتدا سے اختتام سے ذرا پہلے تک اس کا عام ہونا جنوں کا توں پر قرار

آپ کو یہ کردار عام لگتا ہے یا خاص؟ اس کا فیصلہ آپ کریں گے۔
میرا کتابی شکل میں چھپنے والا پہلا ناول آپ کے ہاتھوں میں ہے اور اب یہ آپ کی مرضی ہے کہ آپ کس
کردار کی کن صفات میں اپنی پسندیدگی پاتے ہیں۔

فائزہ افکار گلہور

پھلاں دے رنگ کالے

پچھلے سال چھٹیوں کے بعد وہ جو یادیں لے کے اس گھر سے رخصت ہوئی تھی، وہی سہ روپے اس بار بھی اس کے استقبال کو موجود تھے، کچھ بھی تو نہ بدلاتھا، وہی بی بی جان کی برفیلی میزے چھوٹی لگا ہیں، وہی چچی جان کا دھوپ چھاؤں سا مزاج، وہی تانی امی کا لائق سارویہ، وہی کزنز کا گریز اور وہی درو دیوار کی اجنبیت، باچا جان کی طبیعت میں بھی اسے کوئی خاص تبدیلی محسوس نہ ہوئی، وہ جب بھی چھٹیوں میں گھر آتی انہیں بستر پہ اسی طرح موت کی آہٹیں سننے دیکھتی۔ کوئی نہ کوئی نرس ان کی ڈرپ چیک کر رہی ہوتی اور ان کی کوئی نہ کوئی بہویہ تبصرہ کر رہی ہوتی۔

”باجا جان اس بار بچتے نہیں لگتے، خدا خیر کرے۔“ اور خدا برسوں سے خیر کرتا چلا آ رہا تھا اور باجا جان فوج، بارٹ اٹیک، کینسر اور شوگر کے ہر ہر حملے کے بعد بچ جاتے تھے اور اگر بھی طبیعت بہت سنبھلی ہوتی تو زبان سے چند نونے پھوٹے لفظ بھی ادا کر لیتے اور خدا نے اس کا صیلا دھرتی مفلوج کیا ہی تھا، قوت گویائی بھی متاثر کی تھی۔ اس بار بھی شاید طبیعت کچھ بہتر تھی تبھی ساری اولاد کے اکٹھا ہونے پر انہوں نے وکیل کو بلوا کر وصیت نامہ کروا لی تھی۔

وہ عمر کے اس حصے اور صحت کے اس مرحلے پہ تھے کہ ان کا وصیت تیار کرنا کوئی ایسی غیر معمولی بات بھی نہ تھی۔ انہوں نے تو یہ ہوئی کہ انہوں نے تمام اولاد میں برابر ترکہ تقسیم کرنے کے بعد اولاد کی اولاد میں سے صرف ایک پوتی مقدس زریاب کو امتیازی حیثیت سے اپنے رسل اکاؤنٹ اور خاندانی نوادرات و زیورات کا وارث قرار دیا۔

اکاؤنٹ کے بارے میں تو وہی بہتر جانتے ہوں گے، البتہ نوادرات و زیورات کا تخمینہ کھوں نہیں کروڑوں میں لگایا جا رہا تھا۔ اگرچہ انہیں بیچنا خاندانی حرمت و وقار کے منافی تھا

لیکن بڑی بات تو یہ تھی کہ نسلوں سے یہ ترکہ خاندان کے بڑے بیٹے کی ملکیت میں چلا آ رہا تھا۔ یہ ایک غیر تحریری آئین تھا جس کی رو سے تایا جان افراسیاب خٹک اس کے امین تھے اور باچا جان نے بڑے اور چھوٹے بیٹے کو چھوڑ کر خاندانی عظمت کی یہ نشانیاں اپنی پوتی کو سونپنے کی وصیت کی تھی، ایسی پوتی جس کی حیثیت ہی اس خاندان میں مشکوک سمجھی جاتی تھی۔ نفرت، کراہیت، گریز، لافعلی کے وار تو بچپن سے سہتی چلی آ رہی تھی باچا جان کے منہلے بیٹے زریاب خٹک کی اکلوتی اولاد مقدس، اب عداوت بھی اس کے نصیب میں لکھ دی گئی تھی۔

☆☆☆

”واؤ، کتنی پیاری ہے ناں سانٹھا، بالکل سنڈریلا جیسی۔“

فارحہ نے لیٹ ایڈیشن لینے والی اپنی نئی فرنیچر کلاس فیلو کو دیکھ کے کوئی چوتھی بار کہا۔ اس سے قبل وہ اسے دیکھ کے سنووائٹ اور باری ڈول کے خطاب بھی بے چلی تھی۔ یہ پشاور کا سب سے مشہور کانونٹ تھا جہاں اکثر ممالک کے سفارت کاروں کے بچے زیر تعلیم تھے۔ ”سنڈریلا اتنی موٹی نہیں تھی، تم نے اسٹوری بک میں دیکھا نہیں کیا؟“ دیکھانے چاکلیٹ سے چپکتے ہاتھ ٹشو سے پونچتے ہوئے رشک وحسد کے ملتے جلتے تاثرات کے ساتھ کہا۔ انگلش، جرمن، فرنیچ فیملیز کے بچوں کو ملنے والی توجہ سے وہ اکثر جلیس رہتی۔ ”اور کیا، وائٹ چاکلیٹیشن ہونے سے ہر کوئی سنووائٹ نہیں ہو جاتا۔ ہماری مقدس سے زیادہ کیوٹ نہیں ہے وہ سانٹھا۔“ شاور ہمیشہ کی طرح اپنی فحش گفتگو کے سگلے میں بانٹیں ڈال کے اسے گفتگو میں کھینچ لاتی۔

”لیکن وہ فارنر ہے۔“ فاریہ اپنے پوائنٹ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

”تو کیا ہوا؟“ شاور چبا چبا کے بولی۔ ”مقدس کی مدر بھی فارنر تھیں۔“

”ریٹلی؟“ نوعمر کی بچیوں کا وہ پورا گروپ مارے ایکساٹمنٹ کے چلا اٹھا۔ جب مقدس حیرت سے لنگ نی شاور اپنی پھوپھی زاد کوکتی رہی۔ خود اس کی نو سالہ زندگی میں یہ پہلا انکشاف تھا اس کی ماں کے بارے میں۔

”آئی سویر، میں نے خود سنا ہے۔“ وہ مقدس کی طرف پلٹی۔

”یاد ہے جب ہم اسلام آباد بڑے ماموں کے ہاں گل ریز کی برتھ ڈے پارٹی کے لیے گئے تھے، وہاں متاشا آپ کی اسکول فرینڈز بھی آئی تھیں انہوں نے آپ سے کہا کہ ویسے تو تم بھی کرنز پرینی ہو مگر اس لعل گرل کے فیچرز بہت شارپ ہیں اور لک بھی انگلش ہے تب تانی آپ نے کہا کہ اس کی مدر یعنی ہماری آنٹی فارنر تھیں اور ماما کہتی ہیں مقدس ہو بہو اپنی مدر جیسی ہے۔“

اور یہ تھا پہلا تعارف اس کا اپنی ماں سے۔ کتنا عجیب سا لگتا ہے کسی ایسی بچی کے بارے میں یہ سننا، جو آج کے الیکٹرانک دور میں میڈیا کی بدولت اپنی عمر سے دس گنا زیادہ میچور سوچ رکھتی ہو، جو ایک بھرے پرے خوش حال کپڑے میں پرورش پا رہی ہو، لیکن نو برس کی عمر میں پہلی بار اس نے اپنی ماں کا ذکر سنا ہو، چاہے اس کی ماں مر ہی کیوں نہ گئی ہو۔

شناور اس کی واحد دوست، جس کے قریب آنے کی واحد وجہ بھی یہی تھی کہ وہ بھی اس کی طرح ماں سے محروم تھی۔ لوریاں سننے کی عمر میں جب شناور اپنی ماں کے بارے میں فرضی قصے گھر کے سنایا کرتی کہ کل رات ماما پر یوں کے سے سنہری پر لگا کے گھر کی کے راستے میرے کمرے میں آئیں اور مجھے ڈھیر سا پیار کر کے گئیں تو وہ ادھر ادھر دیکھنے لگتی۔

شناور کے پاس اس کا باپ تھا جو جب بنی ہے ملنے آتا اپنی شریک حیات کی یادیں تازہ کرتا، نانی تھی جو نواسی کو گود میں بٹھا کے بیٹی کے بچپن کی شراتیں سناتی اور ہنستے ہنستے رو بڑتی، ماما کی تصویر تھی جو اس کے بستر کے سر ہانے پر ایک دعا کی طرح آویزاں تھی۔ جب کہ اس کے پاس کیا تھا، ماں کی ہلکی سی شبیہ بھی نہیں تھی جس کے سہارے وہ اس کا سراپا تراشتی، نہ ہی باپ کی رفاقت جو اس سے اس کی ماں کی باتیں کرتا، نہ ہی ماں کے حوالے سے کوئی اور قریبی رشتے جو نواسی کے نقوش میں بیٹی کی پرچھائیں تلاشتے۔

اور اگر اس گھر کے کلین اس کی ماں کا نام تک نہیں لیتے، اسے مکمل فراموش کر چکے ہیں تو یہ کچھ ایسی حیرت کی بات نہیں۔ وہ ایک زندہ وجود لیے ہوئے بھی اس عالیشان گھر میں اپنے ہونے کا احساس دلانے میں ناکام ہے تو غیر موجود لوگوں کی بساط ہی کیا۔

مقدس زریاب نے آنکھ کھولتے ہی اپنے ارد گرد رشتوں کا ہجوم دیکھا، دل کا نہ سہی مگر خون کے رشتوں کا۔ پچا جان تھے جن کے لیے اس کا ہونا نہ ہونا ایک برابر تھا ویسے بھی وہ اپنی والدین کی عزت کے تحت اپنے بچوں تک کے زیادہ قریب نہ تھے، وہ اور ان کی زمینیں، ان کی بڑی بڑی موچھوں اور لمبی لمبی گن رکھنے والے دوست، تاش اور شکار کی محفلیں، گھر میں وہ کم ہی نکلتے یا پھر اکثر سوئے ہوئے پائے جاتے۔ ان کی پڑھی لکھی اور گھر کے گھٹے ماحول سے سدا کی بیزاریتگم، چچی جان جو بے حد موڈی سی تھیں، کبھی تو اپنے بچوں کے ہجوم میں اس کا اور شناور کا بے ضرر سا وجود انہیں بے طرح کھٹکتا، بلا وجہ چڑ جاتیں وہ ان دونوں کی موجودگی سے اور خصوصاً اس کے سامنے تو دبا دبا سا اظہار بھی کر دیتیں کہ اس سے زیادہ کھل کر بدتمیز ہونے کی ان کی تعلیم اجازت نہیں دیتی تھی۔ البتہ شناور کو بی بی جان یعنی اس کی سگی نانی کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس کے سامنے وہ محتاط ہی رہتیں۔ کبھی کبھی محض بی بی جان اور ان کی لاڈلی نواسی کی چڑ میں مقدس پہ خاصی مہربان بھی ہو جاتیں۔ جو بھی تھا بہر حال انہوں

نے محبت و شفقت کے نام پہ نہ سہی، انسانیت اور خدا ترسی کے حوالے سے دونوں لڑکیوں کا مقدر و بھر خیال ضرور رکھا۔

باچا جان سدا کے بیمار، اس نے ہوش سنبھالتے ہی انہیں بستر سنبھالتے دیکھا کبھی کبھی تو وہ اس قدر بیمار پڑ جاتے کہ سارا خاندان اکٹھا ہو جاتا، کئی اہم تقریبات ملتوی ہو جاتیں، کئی ضروری کام التواء میں ڈال دیے جاتے اس خدشہ کے پیش نظر کہ کہیں خدا نخواستہ..... لیکن بڑی سے بڑی تکلیف کے بعد باچا جان بھلے چنگے ہو جاتے، ویسے بھلے چنگے کہنا تو غلط ہوگا یوں کہیں موت کو ٹال کے واپس آ جاتے۔ انہیں اپنے کمرے سے نکلے کئی برس بیت چکے تھے۔ بی بی جان تھیں، باچا جان کی دوسری بیوی، انتہائی طرحدار اور حسین خاتون، نہایت کم عمری میں شادی ہو جانے کی وجہ سے یہ پٹھان زادی، دادی اور تانی بننے کے باوجود انہیں، چالیس سے اوپر کی نہ لگتی تھیں۔ جب کہ باچا جان انہیں خاصے شعلے لگتے، چچی جان کہتیں، بی بی جان اتنی بھی کم عمر نہیں، پچاس کے قریب ہیں۔ بس ویسے ہی عمر ماننے کیوں ان پر نظر کی گئی ہے۔ بالوں کو سفیدی چھو کے گزر گئی، بس چند تاروں کی جھلک ان کے بارعقب سر پہ، نیلی بلور آنکھوں میں چنگاریاں پھوٹتیں اور باریک سرخ لب لہنی سے ایک دوسرے میں ہوسٹ رہتے جیسے کوئی اہم راز اس قید سے باہر نکلنے کو بے تاب تھا اور اسے جبراً سینے میں دبا دیا گیا ہو۔ مقدس کو سامنے پا کے یہ چنگاریاں کچھ اور بھڑک اٹھتیں اور لب زیادہ بھنج جاتے۔ وہ کم ہی اسے مخاطب کرتیں۔ اس کے لیے ان کے رویے میں اتنی جھلک تھی جتنی جھلکتی ہوئی، یا خنکی ہوتی ہڈیوں میں خوف جھاتی ہوئی۔

چچا جان اور مرحومہ پھوپھی بی بی جان کی سگی اولاد تھے۔ پھوپھی شادی کے ایک سال بعد ہی شاد و کو جنم دیتے ہی مر گئیں وہ اور شاد و تقریباً ہم عمر تھیں۔ جب کہ دراب بچا کی انوشہ اور پلو شہ ان سے ڈیڑھ دو سال چھوٹی تھیں۔ ان جڑواں بہنوں کے بچان کے اوپر تانے پھیلنے کا تعلق تھا۔ اس کے سگے تایا افراسیاب خٹک اور بابا جان دونوں بھائی بی بی جان کی مرحومہ سوکن کے بیٹے تھے۔ جنہوں نے انہیں ماں جیسی ہی عزت دی۔

تایا جان اپنی فیملی کے ساتھ اسلام آباد سیشن تھے وہ کچھ سیاست و غیرہ کا شغل رکھتے تھے مقدس کے ساتھ ان کا رویہ بھی کچھ مختلف نہ تھا۔ انہوں نے کبھی نظر بھر کے بھی سکے ماں جائے کی اکلوتی اولاد کو نہ دیکھا۔ اس کے سلام کا جواب بھی وہ بے رغبتی سے منہ پھیر کے دیتے اس کے علاوہ اس کی کبھی ہمت نہ ہوئی ان سے بات کرنے کی، اگر کبھی بھولے بسکے ان کی نگاہ اس پہ پڑ بھی جاتی تو سرخ و سفید چہرہ دکھنے لگتا۔ بڑی بڑی بادای آنکھیں لہو رنگ ہو جاتیں اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل جاتے حالانکہ مقدس کو تو انہیں اٹھتے بیٹھتے، بولتے، مسکراتے ہر

طرح سے دیکھتے رہنا بے حد پسند تھا۔ کیونکہ ہمیشہ سے اس نے یہ سنا تھا کہ اس کے بابا جان اور تایا جان میں خاصی مشابہت ہے۔ اگرچہ گھر میں اس نے اپنے باپ کی کئی قد آور تصاویر آویزاں دیکھی تھیں لیکن تایا جان کی صورت وہ انہیں مجسم دیکھ کے دل کو تسکین دے دیتی تھی۔ جب کہ ماں، ماں کے حوالے سے وہ کوئی بھی ذکر سنتی تو تسکین کے بجائے عجیب سی وحشت دل کو گھیر لیتی۔ اسے یاد تھا ایک بار جب وہ پلو شہ اور شاد و تانی آپنی کی منگنی کی باتیں کر رہی تھیں۔

”کتنی خوب صورت لگ رہی تھیں آپنی۔ میرون شرارے میں اور ان کی لانی گردن میں وہ گلو بند کتنا فخر رہا تھا۔“ یہ پلو شہ کی رائے تھی۔

”اتنے سیک اپ اور جیوری کے ساتھ تو کوئی بھی خوب صورت لگے گا۔“ شاد و کی دہانہ آپنی کے ساتھ کم ہی جھنجھکتی تھی۔

”خیر ایسی بات بھی نہیں۔ وہ ویسے بھی خوب صورت ہیں۔ ہماری پوری فیملی میں صرف انہی کی آنکھیں اور بال بلیک ہیں۔ یہ بھی ان کی انفرادیت ہے۔“ مقدس نے کھلے دل سے تائید کی۔

واہ ایسے ہی، باقی کیا کم ہیں۔ ان سے تو تانیہ زیادہ اثریکٹو ہے۔ میری بھی ہانٹ کچھ کچھ کم ہے، لیکن خیر ابھی میری اتج بھی تو فطنتیں ہے، تھوڑی سی ہانٹ اور بڑھ جائے تو تمہاری تانی آپنی کیا لکس گی میرے آگے۔ تم دونوں بھی اچھی لگو گی، بڑی ہو کے بہت اچھی لگو گی دیکھ لیتا اور یہ مقدس تو ہے ہی بیوٹی کو مین۔“

مقدس نے ان کے ساتھ کتنی ہی باتیں کی تھیں، مقدس کی ماما بے حد خوبصورت تھیں، ان کے جیسے وہ لڑکی، انہوں نے آج تک ایسی حسین عورت نہیں دیکھی، ماما کہتی ہیں ایسی تو نہیں ہوتی۔ ان کا لڑکھائی چاہتا ہے کاش انہوں نے بھی تمہاری ماما کو دیکھا ہوتا۔

مقدس نے تانے پھیلنے کے لیے مقدس کی طرف دیکھا جو بے دھیانی میں سیڑھیاں اترتی بی بی جان کو دیکھ رہی تھی۔ ہلکے انگوری رنگ کے چارجٹ کے شلوار قمیص چکن کی کریم کلر کی بڑی سی چادر اوڑھے وہ کسی قدر باوقار لگ رہی تھیں۔ سلیقے سے گندھے بالوں پہ باریک شہون کا دوپٹہ تھا۔ کانوں سے لٹکی بالیوں کے ساتھ مومے کی تازہ آدھ کھلی کلیاں انکی تھیں۔

ان کی نگاہ اب تک مقدس پہ نہیں پڑی تھی، اس لیے چہرے کے نقوش بگاڑتے ہوئے تلخ تاثرات ناپید تھے۔ اس سے نجانے وہ کیوں اسے بہت اچھی لگیں، شاید اس لیے کہ اس نے کبھی کبھار ہی انہیں نفرت اور بے زاری کے بغیر دیکھا تھا، اسی لیے بے ساختہ کہہ اٹھی۔

”بی بی جان بھی تو کوئی پری ہی لگتی ہیں، اب بھی اتنی حسین ہیں تو پہلے کیا لگتی ہوں گی ہے ناں؟“

”دیکھئے بی بی جان، مقدس کیا کہہ رہی ہے۔“ ثناور، سدا کی منہ پھٹ اور جذباتی، چلا اٹھی۔ اس کا مقصد محض بی بی جان کے دل میں کسی طرح اپنی دوست کے لیے جگہ پیدا کرنا تھی۔ وہ ان کے گریز اور سرد مہری کو ہمیشہ سوتیلے پن کی رعایت دیتی تھی۔ مقدس نے ان کا ہاتھ دبا کے مزید کچھ کہنے سے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر تب تک وہ بی بی جان کو سیر حیاں نیچے اتر کر آنے کی مہلت دیے بغیر شروع ہو چکی تھیں۔

”مقدس کو آپ اتنی پسند ہیں مجھے تو پتہ ہی نہ تھا۔ میں تو سمجھتی تھی آپ کو سب سے زیادہ پیار میں کرتی ہوں، لیکن یہ کہہ رہی تھی کہ بی بی جان اتنی خوب صورت ہیں اتنی خوب صورت ہیں کہ جتنی اس کی اپنی ماما۔ اس کے لیے دونوں ہی۔“

بی بی جان کو طیش میں تیزی سے آگے بڑھتے دیکھ کے اس کی زبان گنگ ہو گئی اور مقدس کسی انجانے جرم کے احساس سے بھی لرزتی مانگوں پہ کھڑی ہو گئی۔

”چنانچہ.....“ اگر محض جسمانی تکلیف کو ہی تشدد کا نام دیا جائے تو بے شک اس کی پندرہ سالہ زندگی کا یہ پہلا تھپڑ تھا جو اسے ماں کے حواس سے ملا تھا۔

”تیری اتنی جرات، تو میرا مقابلہ اپنی ماں سے کرے گی۔ ارے میں اصل خاندان کی، عزت دار الحمد للہ بچی مسلمان، ساری عمر اپنے وقار کو سینٹ سینٹ کر رکھتے گزر گئی۔ اور یہ..... یہ اس حرافہ کی نشانی، مجھے پل بھر میں دو کوڑی کا کر گئی۔ میرا نام اس ہندی کے ساتھ لے کر۔ وہ کافر کی اولاد اور میں اس بد بخت کی نظر میں ایک جیسے ہی ہوں، کھانا دیکھ لی تو نے اس ہندی (ہندو عورت) کی کالی صورت، جو میرے ساتھ مقابلہ کرنے چلی ہے۔ کس نے پھونک دیا تیرے کانوں میں اس کے حسن کے بارے میں۔“

میں بتاتی ہوں تجھے اس کے کالے کر توت، خود تو کہیں منہ کالا کر رہی ہوگی میرے بیٹے کو ذلت سے دو چار کر کے در بدر کر دیا۔ میرا جان برسوں سے اس کے انتظار میں رہا ہے نہ مر رہا ہے۔“

توہین کے احساس سے پھری بی بی جان اس پہ وحشیوں کی مانند پل پڑی تھیں اور پھر باچا جان کی حالت پر اونچی اونچی آواز میں دھوٹے ہوئے نڈھال ہو کے ایک جانب پڑ گئیں۔ پورا گھر حیرت کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہا تھا، اس کے گھر کے در و دیوار نے بھی شاید کسی خان زادی کی اتنی بلند آواز اور کوسنے پہلی بار سنے تھے، یوں لگتا تھا جیسے افراد کے ساتھ ساتھ دیواریں بھی سکتے میں آگئی ہوں اور وہ..... گھٹنوں کے بل زمین پہ بیٹھیں، نیچے ہوئے بال، ادھڑی آستین، سو بچے رخساروں اور ہونٹوں سے نکلتے خون سے بے خبر بی بی جان کا ایک ایک لفظ دہرا رہی تھی۔ پہلی بار اس نے ان کے منہ سے اپنی ماں کا ذکر سنا تھا

اور وہ بھی اس قدر تفصیل سے، اتنے بھیا تک انکشافات کے ساتھ۔ وہ بدن پہ لگی چوٹوں اور ملازموں تک کے سامنے ملنے والی اس ذلت سے بے پرواہ، بس یہ سوچ رہی تھی کہ چلو یہ راز تو کھلا میں یتیم نہیں ہوں، ورنہ زندگی کے کتنے برس اس الجھن کی کھونج میں بیت گئے کہ میری ماں زندہ ہے یا مر گئی یا اس کو طلاق مل گئی، میرا باپ اس دنیا میں کہیں ہے یا..... وہ دونوں اس دنیا کے کسی نہ کسی کو نے میں موجود ہیں۔ اپنے کھوکھلے تعلق کی ایک بد نما یادگار سے یکسر بے خبر، بالکل انجان۔

اور اسی رات اس کے نسل پڑی چوٹوں پہ گرم کپڑے کرتے ہوئے ثناور منت کر رہی تھی۔ ”مقدس، تو انسان ہے یا پتھر، روتی کیوں نہیں، رو، خدا کے لیے رو لو تھوڑا سا۔“

”شانو، کیا میری ماں ہندو تھی..... اور کیا اس کی بیوی سے میں کافر کی اولاد کہلاؤں گی؟“ وہ بولی بھی تو صرف یہ۔ ”ویکھو پہلی بات تو یہ کہ تم ماموں زریاب کی اولاد ہو اور مسلمان ہی کہلاؤ گی۔ اور دوسری یہ کہ میں نہیں ماننی تمہاری ماما ہندو تھیں۔ شاید وہ صیہائی ہوں یا پھر یہودی۔ اتنا تو میں جانتی ہوں کہ اہل کتاب سے مسلمان مرد کا نکاح جائز ہے۔ تو پھر ضرور مسلمان ہونے کے بعد ہی وہ اس گھر میں آئی ہوں گی، اگر بی بی جان کے کہنے کے مطابق وہ کافر تھیں ظاہر ہے کہ ہندو سے تو نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔“

”تو پھر..... پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے بابا جان نے ان سے..... نک..... میرا مطلب ہے نکاح، وہ ایسی نہ ہو۔“ اس نے کہنے کے ساتھ ہی خود اپنے لب دانتوں سے کاٹ لیے گویا یہ بات تھوڑا سا بھی کتنا اذیت ناک تھا اس کے لیے۔

”میں مسلمان.....“ اس نے خاندان کی روایات کو جانتی ہو تم اور یہ بھی کہ کس طرح ان کی روایت کو جانتی ہے۔ سبب جانتے ہیں تمہاری ماما ایک ڈیڑھ سال تک یہاں، اس گھر میں اس رخت خلی میں بہو کی حیثیت سے رہی ہیں کیا ہمارے گھر کے مرد اتنی جرات کر سکتے ہیں کہ بغیر کسی نکاح کے، کسی عورت کو یہاں لا کے رکھ سکیں۔ ارے ہم لوگوں کے دادا، پردادا نے چھ چھ سات سات نکاح کر رکھے تھے لیکن ایسی حرکت..... تو بہ تو بہ ایسا تو سوچو بھی مت۔“ وہ اس عمر میں بھی خاندانی روایات سے بخوبی آگاہ تھی۔

”تو اگر میری ماما مسلمان ہو چکی تھیں تو ان کے پچھلے حوالے کو کیوں یاد رکھا گیا ہے۔“

کیوں انہیں ہندی، کافر کی اولاد جیسے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ ”وہ احتجاجاً بلک اٹھی۔“

”اس لیے کیونکہ.....“ وہ اسے مطمئن کرنے کے لیے کچھ جواز سوچ رہی تھی کہ چچی جان گرم دودھ کا گلاس لے کے اندر داخل ہوئیں اور اس کی مشکل آسان کی۔

”اس لیے بیٹا، کیونکہ انہوں نے اپنا پچھلا حوالہ کسی کو بھولنے نہیں دیا۔ وہ اس خاندان میں رچ بس جاتیں یہاں کے قاعدے اصول اور روایات اپنا لیتیں تو آج شاید کوئی جان بھی نہ پاتا کہ خان زریاب خٹک کی بیوی کہاں سے آئی تھی۔ لیکن شاید وہ آزاد فضاؤں کی باسی چادر اور چادر یواری کی پابندی برداشت نہیں کر پائی۔ کون جانے اب تک وہ مسلمان رہی بھی ہے یا نہیں۔“

تمہارے چچا ان دنوں ہارورڈ یونیورسٹی میں تھے انہیں تمہارے بابا جان نے تصاویر بھیجی تھیں، وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ صحیح طرح نہیں جانتے وہ جرمن تھیں یا انگریز یا فرنگ۔ اپنی شادی کے وقت جب یہاں آئے تو انہیں خبر ہوئی کہ بھائی کی گزشتہ اجڑے کئی ماہ ہو چکے ہیں۔ بی بی جان نے کبھی تفصیل کسی کو نہیں بتائی۔ لیکن مشہور یہی ہے کہ وہ تمہارے بابا کے ساتھ بھانہ سکیں، نہ ہی مشرقی طور اطوار کے تقاضے پورے کر سکیں، شوہر کی غیر موجودگی میں کسی اور کے ساتھ دوستی پیدا کر لی تھی انہوں نے، لالہ زریاب نے انہیں تو غیرت میں آ کے فوراً گھر سے نکال دیا لیکن خود بھی جگہ بنائی کے خوف سے کبھی روپوش ہو گئے۔ خاندان کی ناموس پہ لگا یہ زخم ہمارے بزرگ بھلا نہیں پاسے۔“

”لیکن اس سارے قصے میں میرا قصور کہاں نکلتا ہے۔ میرے ساتھ سب کا رویہ نارمل کیوں نہیں۔“ وہ سر ایا سوال تھی۔

”میں پھر وہی بات کہوں گی کہ اس بار تمہارے بابا نے یہ سب کسی کو بھولنے نہ دیا۔ وہ خود اگر اس سانچے کو فراموش کر دیتے، تمہارے ساتھ سایہ بن کے رہتے، اپنا گھر بسا لیتے تو لوگ بھی کب کے بھول بھال چکے ہوتے۔ ان کی خود ساختہ جلا وطنی اس زخم پہ کھرٹ نہیں آنے دیتی۔ ہر زخم کو مرہم چاہیے۔ جن زخموں کا مٹ کھلا رہ جائے وہ ٹیس تو دیتے ہی ہیں۔ تمہارا وجود باچا جان اور بڑے لالہ کو لالہ زریاب کی یاد دلاتا ہے۔ گاہ گونجا خٹک کا کہ ہیں اور کب آئیں گے۔ حیرت کی بات ہے دونوں بھائیوں نے ان کو ڈھونڈنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ مگر انہیں یقین ہے وہ ضرور ایک دن لوٹیں گے، چودہ سال سے اوپر ہو رہے ہیں مجھے اس گھر میں آئے، میں نے آج تک ان کا کوئی خط، کوئی پیغام، کوئی اطلاع آتے نہیں دیکھی۔ ایک بار تمہارے چچا سے کہا تھا کہ بڑے لالہ اتنے اثر و رسوخ والے ہیں وہ کیوں نہیں کوشش کرتے بھائی کو کھوجنے کی، تو کہنے لگے اس کی ضرورت نہیں، وہ لوٹ آئیں گے بلکہ لوٹنے ہی والے ہیں۔ اللہ کرے ان کا یقین بچ ہی ثابت ہو، اگر ایسا ہو جائے تو تمہارا امتحان بھی ختم ہو جائے گا۔ کون جانے کہ خون کی کشش انہیں کب کھینچ کے نلے آئے۔“ انہوں نے بات مکمل کرتے ہوئے دودھ کا گلاس اس کے لبوں سے لگایا۔

”جی نہیں کرتا چچی جان۔“ اس نے ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے ٹوٹے لہجے میں کہا۔ ”یہ پکڑو شانو، اسے پلاؤ اور یہ سمجھاؤ کہ جن کے لیے اس کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے اور جو اسے دنیا میں لانے کی وجہ بننے کے باوجود اسے بھلائے بیٹھے ہیں ان کی خاطر کیوں خود کو ہلکان کرتی ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، میں اتنی تھی تو گھر میں کیا ہوا، کیسے ہوا کی خبر ہی نہ ہوتی تھی، اسے اس کی کم عمری کے باوجود میں نے وہ تمام تلخ باتیں اور انکشافات بتادیئے، جتنے کہ میں جانتی تھی صرف اس لیے کہ اس کے اندر کے کچھ سوال تو خاموش ہوں۔ جو ہے اسے بدلائیں جاسکتا۔ اپنی زندگی کی قدر کرو۔ اسے جیو اپنی پہچان خود بناؤ۔“

اسے لاہور بھیج دیا گیا۔ کنیرڈ کالج میں فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے جب وہ پہلی بار داخل ہوئی تو اتنی بڑا اعتماد ہر گز نہیں جتنے گزرے دنوں نے اسے بنادیا تھا۔ یہاں کوئی اس پہ، اس کی ذات پہ کچھڑا چھالنے والا نہیں تھا۔ یکسوئی اور ذہنی سکون نے اسے شہر کی جانب راغب کر دیا، ساتھ ہی محنتی صلاحیتیں مکمل کے نکھر کے سامنے آ گئیں۔ اب وہ کالج کی ہونہار طالبہ تھی۔ ایف ایس سی میں ٹاپ کر لینے کے بعد اس نے میڈیکل لائن کو پختا اور کنگ ایڈورڈ میں چلی آئی۔

یہ وہ ڈھائی سال اس نے محض اپنی ذات کی ہمراہی میں گزارے۔ نہ خود کبھی ماں، باپ کے بارے میں سوچنے کی ضرورت محسوس کی اور نہ ہی کسی کو اپنے اتنے قریب آنے دیا کہ وہ اس کے سوئے درد جگاتا۔

تمہارے ماما اور مائی ایف اے کرنے کے بعد اس کے پیچھے پیچھے لاہور چلی آئی۔ اس نے یہ عرصہ بھی بنانے کیسے اس کے بغیر گزارا تھا۔ بی بی جان تو کبھی اسے نہ بھیجتیں مگر اس کے ماما نے اپنے بابا جیم محل خریدی کے کمرے پیش کیا جو اکثر دیشتر اس سے ملنے آتے رہتے تھے۔ اگرچہ پھوپھو کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہی انہوں نے دوسری شادی کر لی تھی لیکن وہ اس گھر سے اپنا رشتہ ختم نہیں کر سکے تھے۔ کیونکہ بی بی جان کے وہ محض داماد ہی نہیں، سکے بھانجے بھی تھے۔ اس کے علاوہ ان کے والد اور باچا جان چچا زاد بھی تھے۔ یوں وہ بلا تکلف آتے جاتے رہتے۔ اس بار مقدس بھی وہیں تھی۔

”بابا جانی پلیز بی بی جان کو سمجھائیے ناں، یہاں پورے سرحد میں کوئی آرٹ اسکول نہیں ہے۔ میں فائن آرٹس میں ماسٹرز کرنا چاہتی ہوں۔ اگر مجھے این سی اے میں ایڈمیشن نہ دلایا گیا تو مزید آگے ہر گز نہیں پڑھوں گی۔“

یہ دھمکی بی بی جان کو بھی کچھ سوچنے پہ مجبور کر گئی۔ اس کی بات بہت پہلے سے افراسیاب خان کے بڑے بیٹے گل ریز خان خٹک سے ملے تھی جو لندن میں اعلیٰ تعلیم کی منازل طے کر رہا تھا۔ جب کہ شانو کو سرے سے پڑھائی کی طرف دلچسپی ہی نہ تھی۔ وہ جانتی تھیں زمانہ بدل رہا ہے، بچے اپنے بزرگوں کے فیصلوں میں نقص نکالنے کو تیار رہتے ہیں، کہیں تعلیم کی کمی اس رشتے کے ختم ہونے کا جواز نہ بن جائے۔ شاید اپنی مرضی کی تعلیم اسے پڑھنے لکھنے کی جانب راغب کر ہی دے۔

”چلو کم از کم کوئی تو وارث ٹھہرے گا تمہارے ماموں کے رنگوں سے کھینچنے کے شوق کا۔“ وہ مسکرا کے بولے۔

”ماموں؟ کون سے ماموں۔ چھوٹے ماموں تو ہرگز اس طرف مائل نہیں ہو سکتے تو کیا بڑے ماموں مصوری کا شوق رکھتے تھے؟“

”نہیں وہ تمہارے بچھے ماموں، خان ذریاب خٹک، وہ جوان تھا تعلیم کی کام رنگوں کا، حسن کا۔“ وہ نجانے کیوں اداس ہو گئے آخر میں لڑکیوں کا ہاتھ گزارا تھا۔ شناور ان کے بارے میں اور بھی کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن بی بی جان کے سبب چہرے اور بابا کے شکستہ تیور دیکھ کر الجھ سی گئی۔ ماحول پہ ایک بوجھل پن سا طاری تھا۔ مقدس عرصے بعد ابھرتے تجسس کے احساس سے گھبرا گئی۔ وہ پھر سے اس کیا، کیوں، کب اور کیسے کے جال میں پھنسنا نہیں چاہتی تھی۔ بہت مشکل سے اپنے منتشر ذہن کو ایک سمت کی طرف مائل کیا تھا اس نے کچھ بن جانے کا، اپنی شناخت خود بنانے کا۔

شناور کے لاہور آ جانے سے بھی اس کی یکسوئی میں خلل پڑا۔ وہ اکثر انجانے میں اس کے خوابیدہ تجسس کو جگا دیتی۔ ایک دن تو بھند ہو گئی۔

”تم چلو تو ایک بار میرے ہاسٹل، دیکھو تو سہی میں غلط نہیں رہ رہی۔“

”میں نے کب کہا تم غلط کہہ رہی ہو۔ ہو جاتی ہے اکثر ایسی مشابہت، لیکن میں کیا کروں گی اس عورت سے مل کے۔“

”قسم سے میں تو اسے دیکھ کے حیران ہی رہ گئی، ہو ہو تمہاری آنکھیں، یہی ناک، چہرے کا نچلا حصہ جلا ہوا ہے اس کا، وہ نہ کیا پتا تم دونوں ہم شکل ہی کہلاتیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو ایک بار میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں یہ تمہاری ماما ہی نہ ہوں۔ لیکن خیر اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ پٹھان ہی ہے بالکل دیہاتی قسم کی، کسی پہاڑی علاقے کی لگتی ہے۔ ماتھے اور رخسار پہ تل گوڑے ہوئے ہیں، یہ لمبا گھونگھٹ نکالتی ہے، لیکن کبھی بغیر کسی تعلق اور رشتے کے بھی جس درجہ مشابہت پائی جاتی ہے دو انسانوں میں، تم ایک بار اگر دیکھو۔“

”لیکن میں کیوں دیکھوں۔ میں نے اپنی آنکھیں ہزار بار دیکھی ہیں، یہ چہرہ دن میں کئی بار آئینے میں دیکھتی ہوں، پھر ایسی ہی آنکھیں، ایسی ہی ناک دیکھنے کے لیے فضول وقت کیوں ضائع کروں۔ خدا کے لیے شانو اب بڑی ہو جاؤ، ایسی ایسی باتیں کرنی ہو کہ خدا کی پناہ، ایک پہاڑی دیہاتی عورت سے خواہ مخواہ مجھے جوڑنے کی کوشش کر رہی ہو محض اس بناء پہ کہ ہماری آنکھوں کا رنگ ایک ہے۔“ وہ بیزاری سے بولی۔

”مجھے تو حیرت اس بات پہ ہوئی کہ پورے خاندان میں کسی سے تمہارا نقش نہیں ملتے، جب کہ ایک بالکل انجان عورت، ہمارے ایشیا کے کچن میں کام کرنے والی۔۔۔۔۔“

”میلیز شناور جسٹ اسٹاپ اٹ۔ ایک بات کے پیچھے مت پڑ جایا کرو۔“ اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے تو وہ جب ہوئی۔

بی بی جان سے بڑی ہی بحث کے بعد میں نے ذریاب ماموں کے اسٹوڈیو کی چابی حاصل کی ہے۔ چلو اٹھو چلتے ہیں۔“

”کیا؟ بارا کے اسٹوڈیو کی چابی؟ گر بی بی جان تو ان کے دونوں کمرے لا کر رکھتی ہیں۔ نہ کوہانے کی اجازت نہیں، پھر نہیں کہوں جالے دے رہی ہیں۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”بس، مشکل سے سمجھا پائی انہیں، انکی سرائی کے لیے مجھے پانچ فرسٹ اور یونک (میں نے آج پتا چلا ہے اس کے لیے اس ماما چاں کی کچھ پینٹنگ دے دوں گی) دینا پڑی ہوئی تھی تاکہ کچھ انسپائریشن مل سکے۔“

”تو پھر جلدی کرو۔“ وہ میٹزینا لے کے نیم دراز ہو گئی۔ ”میں ان بھرنی“

اجازت کے بغیر اس نے اس کے کمرے میں داخل ہو گئی۔

”میں نے کب کہا تم غلط کہہ رہی ہو۔ ہو جاتی ہے اکثر ایسی مشابہت، لیکن میں کیا کروں گی اس عورت سے مل کے۔“

”قسم سے میں تو اسے دیکھ کے حیران ہی رہ گئی، ہو ہو تمہاری آنکھیں، یہی ناک، چہرے کا نچلا حصہ جلا ہوا ہے اس کا، وہ نہ کیا پتا تم دونوں ہم شکل ہی کہلاتیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو ایک بار میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں یہ تمہاری ماما ہی نہ ہوں۔ لیکن خیر اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ پٹھان ہی ہے بالکل دیہاتی قسم کی، کسی پہاڑی علاقے کی لگتی ہے۔ ماتھے اور رخسار پہ تل گوڑے ہوئے ہیں، یہ لمبا گھونگھٹ نکالتی ہے، لیکن کبھی بغیر کسی تعلق اور رشتے کے بھی جس درجہ مشابہت پائی جاتی ہے دو انسانوں میں، تم ایک بار اگر دیکھو۔“

”میں نے کب کہا تم غلط کہہ رہی ہو۔ ہو جاتی ہے اکثر ایسی مشابہت، لیکن میں کیا کروں گی اس عورت سے مل کے۔“

”قسم سے میں تو اسے دیکھ کے حیران ہی رہ گئی، ہو ہو تمہاری آنکھیں، یہی ناک، چہرے کا نچلا حصہ جلا ہوا ہے اس کا، وہ نہ کیا پتا تم دونوں ہم شکل ہی کہلاتیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو ایک بار میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں یہ تمہاری ماما ہی نہ ہوں۔ لیکن خیر اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ پٹھان ہی ہے بالکل دیہاتی قسم کی، کسی پہاڑی علاقے کی لگتی ہے۔ ماتھے اور رخسار پہ تل گوڑے ہوئے ہیں، یہ لمبا گھونگھٹ نکالتی ہے، لیکن کبھی بغیر کسی تعلق اور رشتے کے بھی جس درجہ مشابہت پائی جاتی ہے دو انسانوں میں، تم ایک بار اگر دیکھو۔“

سے مسکرا دی۔

”میں بھی ان ہی کی ایک چیز ہوں جسے کبھی نہ کبھی تو انہوں نے چھوا ہی ہوگا۔ میں بھی ان ہی کی ایک تخلیق ہوں جسے دیکھنے کو ان کا کبھی جی نہ چاہا۔“

اور واقعی ایک روز پہلے تک اس کے دل میں کوئی خواہش نہ تھی اپنی ہستی کے سربستہ رازوں سے واقف ہونے کی۔ لیکن باچا جان کی وصیت نے تو گویا ایک دھماکا کر دیا۔ ہر ایک انگشت بدن داں تھا۔ ہر فرد خصوصاً تایا جان اور چچا جان اسے قہر آلود نگاہوں سے گھورتے گزرتے تھے۔ چچی جان نے اسے بی بی جان کے قبر سے بچانے کے لیے کمرے میں بند کر دیا تھا۔ لیکن بی بی جان کی غضب ناک آوازیں اور تائی جان کے بلند کونے اسے دیواریں چیر کے دھمکا رہے تھے۔ ایک عرصہ ہوا اس نے اپنی ذات اس گھر کے مکینوں سے اس قدر الگ تھلگ کر لی تھی کہ ان کے کسی قسم کے رویے کی دھوپ اس تک نہ پہنچ پاتی تھی۔

آج برسوں بعد وہ پھر زیر عتاب تھی اور اس بار کمری کچھ زیادہ ہی تھی کیونکہ پہلے ان کا ہدف اس کی ماں کا مشتبہ حوالہ تھا۔ خاندان کو اس کے ماں باپ کی طرف سے نئے خاندانات کا غم و غصہ تھا اور اب کی بار وہ خود انہیں مشتعل کرنے کا منصوبہ بنی تھی۔ اس کی خاطر اس کی بے مول و بے وقعت ہستی کی خاطر باچا جان نے صدیوں پرانی روایت توڑ ڈالی تھی۔ معتبر بیٹوں کے ہوتے ہوئے اسے خاندانی ورثہ کا امین قرار دیا تھا۔ وہ خود نہیں سمجھ پارہی تھی کہ ان کے اس فیصلے کے پیچھے کیا مقصد رہا ہوگا۔ ترس، ہمدردی، ازالہ یا آخری وقت میں کی گئی کوئی نیکی سمجھ کے وہ اپنی اس نظر انداز کی جانے والی پوتی کو خاندان بھر میں اہم بنانے جا رہے ہیں۔

”لیکن ان کے اس عمل میں میری کون سی بھلائی ہو سکتی ہے۔“ وہ سوچتی رہی۔

”یہ لوگ، میرے سر پرست جو تمام ترک و دورت کے باوجود میرے گمران کہلاتے ہیں، میری تعلیم، رہائش اور تمام اخراجات برداشت کرتے ہیں، ان ہی لوگوں سے میری دشمنی پیدا کر دینے میں میری کیا بھلائی ہو سکتی ہے۔ کیا تایا جان بھی اس کا شکار نہیں ہوگا؟“

کیا ان کی اولاد بھول پائے گی اس بات کو کہ میں ان کا حق انجام دینے میں ہی سہی مگر ہڑپ کر گئی۔ کیا بی بی جان کو گوارا ہوگا وہ بالشت بھر کی لڑکی، جسے مخاطب کرنا بھی وہ اپنی توہین سمجھتی ہیں، ان کے گھر اتنا اونچا زتبہ حاصل کر بیٹھے گی۔

باچا جان تو ظلم کر رہے ہیں میرے ساتھ میں پہلے ہی بے سہارا ہوں، وہ مجھے دشمنوں کے زخمے میں دیے جا رہے ہیں۔ مجھے ان سے بات کرنا ہوگی۔ انہیں اپنا فیصلہ واپس لینے پہ مجبور کرنا ہوگا۔ اگر انہوں نے میری دلجوئی کی خاطر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ اپنے فیصلے بیٹے کی غیر موجودگی میں بھی اسے کتنا اہم جانتے ہیں، یہ اقدام کیا ہے تو میں یہ تسلیم کر لوں گی

کہ ہاں باچا جان، آپ نے انصاف سے کام لیا۔ آج بیس سال بعد میں آپ کو نظر آئی گی۔ لیکن بس..... بس اتنا ہی..... اتنا ہی کافی ہے کہ..... میں آپ کی نظر میں آ گئی۔

بس..... مگر مجھے دوسروں کی نگاہ میں تو غاصب مت ٹھہرایے میں جھلسی ہوئی ہوں، بپتے مزاجوں کی مار سے، انجام نے جرموں کی سزا بھگت رہی ہوں، بیس برس سے۔ اب تک ماما کی بے وفائی اور بابا کی بے اعتنائی کی سزائیں جھیلی آ رہی ہوں۔ اب آپ کی ہمدردی کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔ آپ کی یہ مہربانی بہت مہنگی پڑے گی مجھے باچا جان، جو خاندان میری ماں کا ایک غیر قوم سے ہونا گناہ عظیم قرار دے کے مجھے اپنی مکمل شناخت دینے سے انکاری ہو جب کہ میری رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا ہے جو ان کے لیے باعث افتخار ہے چاہے مجھے جہنم اک ایسی عورت نے ہی کیوں نہ دیا ہو جو ان کے لیے باعث شرم ہے۔

یہ لوگ مجھے اپنی اولاد کے برابر کھڑا کرنا پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ ماں اور باپ دونوں کی طرف سے اصل نسل ہیں، جب کہ میرے خون میں ملاوٹ ہے ان کی نظر میں، تو پھر اپنی اولاد سے اوپر کیسے دیکھ سکیں گے مجھے، مجھے کہیں جائے بنا نہیں ملے گی۔

اس نے فیصلہ کر لیا لیکن اس فیصلے پر عمل کرنے کی ہمت پیدا کرنے میں وہ قطعی ناکام ثابت ہوئی۔ کا اندازہ اسے اسی رات ہو گیا جب باچا جان کے کمرے میں اسے کاغذات پر دستخط کرانے کے لیے طلب کیا گیا۔

اوپری چھتوں والے بڑے سے کمرے میں پہلا قدم وھرتے ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد درد دوڑ گئی اور یہ سرد لہر اس قدر خالم تھی کہ اس کا لمس پاتے ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی نے اس کے دہکے دھکا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔

باچا جان کا استحقاقی و عوامی اپنی بچی کچی دشوار سانسوں کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ وکیل باچا جان سے اس کے بدم فقیہ ہوتی لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ چچا جان نے جیسے شکار کی چال اٹھائی ہوئی تھی ان کی نگاہیں مقدس کا نشانہ لے رہی تھیں اور تایا جان اسے راستے سے ہٹانے کے لیے شاید کوئی سیاہی چال چلنے کا سوچ رہے تھے اور..... اور..... بی بی جان ان پر ایک ڈری ڈری سی نظر ڈالنے کے بعد تو اس کی ہمت نے دل کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کس حوصلے اور جرات سے اس نے یہ ہمت مجتمع کی اور دل کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دیا تھا، لیکن اب وہی ہمت ہاتھ چھڑا کے دل سے ایک ایک سیڑھی پھسلتی جا رہی تھی۔

دھڑام..... اس کے گھٹنے بے جان ہو کے مڑ گئے، وہ فرش پہ گرنے ہی والی تھی کہ نرس نے آگے بڑھ کے اسے سنبھالا، باچا جان کے بستر کی قریبی کرسی پہ بٹھاتے ہوئے ایک ہمدردی بھری

نظر اس کے ٹھنڈے ٹھار نیلے ہوتے چہرے پہ ڈالی اور پھر تاسف سے سر ہلاتی باہر چلی گئی۔ وہ انجان، بے گانی ملازمہ شاید اس سارے قصے سے اس کی نسبت زیادہ واقف تھی۔ اسے اپنی کم آگاہی پہ اور بے بسی محسوس ہونے لگی۔

”لو بیٹا، یہاں سائن کر دو۔“ وکیل صاحب نے قلم اور کاغذ اس کے آگے کیا۔
”یہ تحریری ثبوت ہوگا اس بات کا کہ ایک عاقل و بالغ آزاد فرد کی حیثیت سے تمہیں اپنے دادا کی اس وصیت پہ کوئی اعتراض نہیں۔ نس کی رو سے تمہیں اس خاندان میں صدیوں سے چلے آ رہے قیمتی نوادرات، زیورات اور اپنے آباؤ اجداد کی دیگر نشانیوں کا وارث ٹھہرایا گیا ہے۔ تم ان کی حفاظت خلوص نیت سے کرنے کی پابند ہوگی، نیز تمہیں اس کی خرید و فروخت کرنے یا کسی غیر خاندان کے فرد کو انہیں تحفہ یا قیمتا دینے کی ممانعت ہے۔“

”ایک منٹ وکیل صاحب“ تایا جان بے چینی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔
”باچا جان ایک بار اور سوچ لیجئے، آپ جذباتی ہو کے فیصلہ کر رہے ہیں۔ میں باچا جان نے ان سنی کرتے ہوئے اپنا نیلی انگریزی ہوئی، زخمی زبوں والا ہاتھ آگے بڑھا کے وکیل کو کارروائی جاری رکھنے کا حکم دیا۔ اس کا گود میں دھرا کپکپاتا ہاتھ جب آگے نہ بڑھا تو وکیل صاحب نے کاغذ اس کے سامنے دھرا اور قلم مزید آگے کر کے اسے تھمانے کی کوشش کی۔ قلم اس کی انگلیوں سے مس ہوا تو ان کی کپکپاہٹ بھی منجمد ہو گئی اور اس کا بھاری ہوتا سر سائیں سائیں کرتا ہوا بے جان سا ہو کے اس کی گود میں آگرا۔

”اوصدا، یہ بے ہوش ہو چکی ہے۔ نرس، نرس۔“ وکیل صاحب نے ایمر جنسی نیل دیے کے ساتھ ساتھ آوازیں بھی دیں۔

باچا جان سر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے دیکھنے لگے۔ نرس نے آگے بڑھ کے بلڈ پریشر چیک کیا۔

”او، بی بی بہت لو ہے۔ سر ہائی بلڈ پریشر کے مریض ہیں میرے پاس اس وقت لو بی پی کی کوئی میڈیسن نہیں میں ٹیبلٹ لکھ دیتی ہوں آپ منگوا دیجئے۔“ ان کے ہوش میں آنے پہ دے دوں گی۔“ وہ ہاتھ پر سہلاتے ہوئے بولی۔

”یہاں..... اسے..... ادھر لاؤ“ باچا جان ہمت کر کے بولے۔ اس نے فوراً ہی اسے کرسی سے بیڈ پہ ان کے پہلو میں منتقل کر دیا۔

”سر میں ان کے لیے جوس بنواتی ہوں۔“ وہ باہر نکل گئی تو وکیل صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔
خان صاحب مجھے اجازت دیجئے۔ میرا خیال ہے اس وقت یہ کام نہیں ہو سکتا۔ آپ

☆ ☆ ☆ پھر مجھے طلب کر لیجئے گا خدا حافظ۔

نیم بے ہوشی کے عالم میں اس نے خود کو چند قد آور گہرے سایوں کے نرغے میں پایا۔ وہ اپنی برف میں لگی انگلیاں ترخ ترخ کی آواز کے ساتھ کھولتے ہوئے قدموں میں پڑا قلم اٹھانا چاہتی ہے، لیکن ہر بار اس کا ہاتھ قلم کو چھونے سے پہلے ہی کوئی ٹھوکر مار کے اسے چند قدم اور دور کر دیتا ہے۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے چاہے تو بی بی جان نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کے منہ پہ جمادیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بے بسی کے ساتھ ہاتھ پر ہلاتی رہی اور تایا جان، چچا جان اور بی بی جان اس کے سامنے ہی اس کے ایک ہم شکل وجود کے پرچے اڑا رہے تھے۔ یہ وجود جو خود اس کا تھا۔

”مگر میں..... میں تو..... بی بی جان نے میرے لبوں پہ ہتھیلی جمار کھی ہے اور..... میں خود ہی اپنے آپ کو کیسے بکھرتے دیکھ رہی ہوں۔“
یہ خیال اس کے بے ہوشی میں ڈوبتے وجود کو ہاتھ تھام کے ہوش کی سرحد پہ کھینچ لایا اور اس کے کانوں میں آتی آوازیں اسے یاد دلانے لگیں کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔

”آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں باچا جان۔“
تایا جان کی آواز میں برہمی تھی، غصہ تھا اور جھنجھلاہٹ تھی۔ وہ اتنا اثر و رسوخ، رعب و دبدبہ رکھتے ہوئے بھی اس نجیف وجود کے سامنے بے بس تھے۔ ان کا ادب، ان کا لحاظ بہت کچھ سہنے پر مجبور کر رہا تھا۔

ان خاندان سرحد کے چند ممتاز اور قابل احترام خاندانوں میں شمار ہوتا ہے اور ایک زمانہ میں خلیفہ کی بڑے بیٹے کی حیثیت سے جانتا ہے، یہ حقیقت بھی سب پہ عیاں ہے کہ ہمارے ہاں باپ اپنے بیٹے کو خاندانی پشت در پشت چلے آ رہے قیمتی ورثے کی جالی بنائے کر اس کی جائیں کا اعلان کرتا ہے۔ جب کہ آپ کا یہ قدم میری حیثیت مشکوک کر دے گا۔“

”تمہاری..... حیثیت پر..... کک..... کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ باچا جان نے اطمینان دلانا چاہا۔

”کیسے نہیں پڑے گا۔ بلکہ میری سیاسی پوزیشن بھی خطرے میں پڑ جائے گی، آپ کا حوالہ میرے لیے محترم سہی مگر میں نے خود اپنی شناخت ایک لمبی جدوجہد کے بعد حاصل کی ہے۔ ملک کے سیاسی اُفق پہ اس وقت میرا نام ایک بے داغ شخصیت رکھنے والے سیاست دان کا ہے۔ لیکن اب لوگ میرے بارے میں چہ میگوئیاں کریں گے۔ جسے اس کے خاندان والے، اس کا باپ قابلِ اعتبار نہ جانیں، عوام کیسے اس کی ذات پہ بھروسہ کر لے گی۔ اگر آپ

نے اپنا فیصلہ نہ بد، تو اس بار الٹیشن میں میرا جیتنا ناممکن ہے۔ آپ جانتے ہیں ہماری پختون برادری کی ذہنیت کو وہ لوگ خاندانی ناموس کو اول جانتے ہیں۔ برائے مہربانی اپنے فیصلے میں ترمیم کیجئے۔“ وہ منت پہ اتر آئے۔

”میرا فیصلہ..... اٹل..... ہے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ وہ جیبوں میں ہاتھ ڈھونڈتے کھڑے ہو گئے۔

”میں اپنا حق وصول نہ بخوبی جانتا ہوں۔ اپنی برسوں کی محنت سے حاصل کیا گیا یہ مقام ہر حال میں بچاؤں گا۔ اپنے مل بوتے پہ بنائے اپنے سیاسی کیرئیر کو میں آپ کی بلا وجہ کی ضد پہ ہرگز قربان نہیں کروں گا۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولے تو اب تک خاموش بیٹھے پچا جان اور بی بی جان بھی چونک اٹھیں آخر دراب پچا جانے بولنے میں پہل کی۔

”وہ ہمارے پاس زریاب لالہ کی امانت ہے بڑے لالہ۔ یہ بات آپ کو یاد رکھنی چاہیے۔“ جانتا ہوں، اسی لیے تو..... اس لیے تو..... وہ مٹھیاں پہنچنے لگے۔

”ورنہ اس کی صورت مجھے اس نامرادہ بد بخت کی یاد دلاتی ہے۔ جہاں کی یاد نے ہاتھ تھام رکھا ہے۔ اس نے جاتے ہوئے منت کی بھی میری کہ یہ لڑکی اس خاندان میں ہی رہنی چاہیے۔ اس کی ماں کا سایہ بھی نہ پڑنے پائے اس پہ۔“

”اور ہمیں یہ عہد نبھانا ہی ہے۔“ دراب خٹک نے پُرسوج انداز میں کہا۔

”خاص طور پر اس لیے کہ اب زریاب لالہ کے آنے میں دیر ہی کتنی ہے۔ میرا تو خیال ہے باچا جان کہ آپ کچھ عرصہ مزید انتظار کر لیں۔ لالہ کے آنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کیجئے گا۔“ ان کی ہادونق پوشش گوئی سن کر مقدس پوری طرح حواسوں میں آ گئی، اب اسے اپنا آنکھیں موندے رکھنا دشوار لگنے لگا۔

”کہاں ہیں میرے بابا؟“

”کب آنے والے ہیں وہ؟“

”کیوں اتنے عرصے سے غائب ہیں وہ؟“

ان سب سوالوں کے جواب وہ کمرے میں موجود نفوس کے چہروں سے کھرج کر پڑھنا چاہتی تھی۔

”اور کیا پتا وہ بھی اس بد بخت کی صورت دیکھنا چاہے گا یا نہیں۔“ بی بی جان کے سفاک تبصرے نے اسے آنکھیں کھولنے سے پھر روک دیا۔

”اسی لیے..... اسی لیے تو..... میں یہ..... یہ کر رہا ہوں اتنے سالوں سے وہ ہم سب

کی وجہ..... کم از کم اب تو..... اسے اولاد کا سکھ، اس کے دل کو صاف کرنا ہے۔“ باچا جان کی دشوار اکھڑی سانسوں میں مدھم فقروں سے چند الفاظ بے ربط سے انداز میں اس کے کانوں میں پڑ گئے۔

بے وفائی کے داغ یونہی نہیں صاف ہو جاتے دلوں سے۔“ دراب پچا تکی سے بولے۔

”نجانے کیا ڈھن سوار ہو گئی ہے آپ کو باچا جان، بھلا جائیداد میں اس لڑکی کو حصہ دار بنانے سے ان ساری باتوں کا کیا تعلق ہے۔ کیا مل جائے گا اس سارے بکھیرے سے۔“

”تلافی۔“ باچا جان کے لبوں سے کراہ کی صورت ایک لفظ نکل کر فضا میں ٹھہر گیا۔ لمحہ بھر کو سب ساکت ہو گئے۔ تایا جان اور پچا جان کی خاموشی میں استعجاب تھا اور بی بی جان کے سکوت میں کسی انہونی کا خدشہ۔

”تلافی کیا ظلم ہوئے ہیں یہاں اس پہ۔“ کچھ دیر بعد تایا جان گویا ہوئے۔

”کیا اس کی تعلیم یا تربیت میں کسی بات کی کمی رہ گئی ہے۔ رہی بات لاڈ پیار جتانے کی وہ یہ دلوں کے معاملے ہیں اور خٹک خاندان میں کوئی منافق نہیں۔ جو وجود آپ کے کھرٹڈ کھر چتا رہے اسے آپ سر آنکھوں پہ تو نہیں بٹھا سکتے۔ یہی کیا کم ہے کہ وہ اس عورت کی بیٹی ہونے کے باوجود اس سچت تلے رہتی آئی ہے۔ پھر بھی..... پھر بھی اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہاں اس کے ساتھ کوئی نا انصافی ہوئی ہے اور اس کا احساس آپ کے دل پر بوجھ پڑھا رہا ہے تو اس کی تلافی کا کوئی اور طریقہ بھی تو ممکن ہوگا۔“ تایا جان ہر صورت وہ فیصلہ بدلنا چاہتے تھے۔ کھرٹڈ کے طول و عرض میں ان کے بے تابانہ گھومتے قدموں کی دھمک اسے بخوبی سنائی دیتی تھی۔

”لیکن افسر سیاب کا ایک ہی بیٹا ہے اور سب جانتے ہیں وہ شناور سے منسوب ہے۔“ بی بی جان نے خٹکی بھرے انداز میں جتایا۔ ”اور دراب کے دونوں لڑکے۔“ انہوں نے کچھ کہنے سے قبل بیٹے کی طرف دیکھا وہ محض کندھے اچکا کر رہ گئے۔ ان کا تعلق اپنی اولاد سے ایسے ہی تھا۔

”نہیں بی بی جان وہ دونوں ہی اس سے پانچ چھ سال چھوٹے ہیں۔ کیوں باچا جان۔“ تایا جان نے کہا۔

”ہاں..... اتنا فرق..... یہ تو ظلم ہوگا اس پہ..... ایک اور ظلم۔“

رہی ہوں گی اور دائیں جانب دراب چچا کے حصے میں بھی زندگی جاگ رہی ہوگی۔

انوشہ اور پلوشہ کے کمرے تو اوپر والے پورشن میں اس کے کمرے کے ساتھ ہی تھے، لیکن ان کے بھائیوں کے کمرے والدین کے ساتھ ہی متصل تھے۔ دراب چچا کی راتیں جاگتی تھیں اب بھی مردانے میں، جسے ان کے ہاں ”حجرہ“ کہا جاتا ہے۔ ان کے دوستوں کی محفل عروج پہ ہوگی۔ اگرچہ حجرہ اس عمارت سے باہر لان کے دائیں طرف بالکل الگ تھلگ ہے، لیکن مقدس جانتی تھی کہ چچی جان دراب چچا کی غیر موجودگی میں سوئی جانتی کیفیت میں رہتی ہیں اور رات بھر اٹھ اٹھ کر کچن میں جا کر ملازموں کے ہاتھ کبھی چائے، کبھی قہوہ خشک میوہ جات کے ساتھ بھجواتی رہتی ہیں۔ اس لیے وہ نہایت احتیاط سے چلتی ہوئی اوپر کی طرف جاتی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اس نے سیڑھیوں کی لائٹ بھی آن نہیں کی، حتیٰ کہ ہاتھ میں دینی تاریخ کی مدد بھی نہ لی۔ اوپر آ کے اس نے اندر کے دروازے پر ہاتھ رکھا۔

سائے کی طرف ٹیرس سے لان میں جلتی لائٹ اس کی روشنی اندر تک آ رہی تھی، ساتھ ہی رات کے اس پہر کی ٹھنڈک تمام تر سفاکی کے ساتھ بڈیوں میں اترتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اس پورشن میں پہلی بار آئی تھی۔ یہاں بابا جان کا بیڈ روم، ان کی اسٹڈی اور اسٹوڈیو تھا۔ اس نے سب سے پہلے دروازے میں ایک ایک کر کے چابیاں لگانا شروع کر دیں۔ اگرچہ شناور نے اسے چابیوں کے نمبر بتا دیئے تھے لیکن تاریکی کی وجہ سے وہ نمبر پڑھنے سے قاصر تھی اور کمرے میں جانے سے پہلے لائٹ جلا نا بھی نہیں چاہتی تھی۔ آخر کار چوتھی چابی ڈالتے ہی لاک ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ کھل گیا۔

اس نے ہینڈل گھما کے دروازہ دھکیلا، کم استعمال ہونے کی وجہ سے دروازہ کھلنے پر جڑا ہٹ سی پیدا ہوئی اس نے سہم کے خود کو ساکت کر لیا اور دم ساہ کر کھڑی ہوئی۔ چچا کے لمبے اطمینان کر لینے کے بعد اس نے دروازہ مزید کھولنے کی بجائے ترچھا ہو کے سرکتے ہوئے اندر آنا زیادہ بہتر جانا۔ اندر کی خشک تاریکی میں اس کے جسم پہ ایک عجیب سا لرزہ طاری ہو گیا۔ کئی منٹ لگا کے آہستہ آہستہ رگ رگ کے اس نے دروازہ دوبارہ بند کیا۔ اس سے پہلے وہ اس کمرے میں کبھی نہیں آئی تھی، اس لیے اندازے کے ساتھ ٹولتی ہوئی کھڑکی کے پاس آئی اور پردے برابر کرنے کا اطمینان کیا تا کہ اندر کی روشنی باہر نہ جائے پہلے اس نے تاریخ آن کی۔ ہلکی زبر روشنی میں سفید سفید لمبے چوڑے سائے اسے خوفزدہ

کر گئے۔ جلدی سے سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مار کے اکٹھے دو تین جن نیچے کر دیئے۔ ٹیوب لائٹ کے ساتھ ایک لمپ اور پنکھا بھی آن ہو گیا۔ وہ لمبے سفید سائے دراصل جہازی سائز کے صوفوں اور بینڈ پہ ڈھکی سفید چادروں کے تھے۔ پنکھے کی تیز ہوائ نے اس کے دانت کڑکڑا دیئے۔ پھر سے پنکھے اور ٹیوب لائٹس کے جن آف کرتے ہوئے وہ لمپ کی خواہناک روشنی میں کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

شناور نے پہلے ہی بتایا تھا کہ اس کمرے میں اس کے بابا جان اور ماما کی کوئی تصویر موجود نہیں مگر پھر بھی اس نے ڈریسنگ ٹیبل اور بینڈ کی سائڈ ٹیبلز کی ایک ایک دراز کو کھنگال لیا۔ ان میں پرانے اخبار، چند ایک کاروباری نوعیت کی بوسیدہ فائلز اور رسالے موجود تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل پہ کبھی، چاندی کا جیوری ہائیکس موجود تھا۔ دروازوں میں ڈھیروں چاندی کے اور موٹے جڑے پڑے تھے، لیکن کہیں اس کے ماما کی کوئی تصویر موجود نہ تھی۔ شاید کسی نے پورا کمرہ جوں کا توں چھوڑتے ہوئے صرف اس جگہ سے اس کی ماں کی موجودگی کے اثرات کو غائب کیا تھا وہ بغلی دروازہ کھول کے اسٹوڈیو میں داخل ہوئی۔ دیواروں پہ کئی قدرتی مناظر مہارت سے پینٹ کیے ہوئے تھے۔ زمین پہ رنگوں کے ڈبوں اور ٹیوبز کا خشک ہوا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ یہ کمرہ گرد سے اُٹا پڑا تھا، شاید صفائی کرنے والے نے کسی ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔

لان میں کھلنے والی کھڑکی کا شیشہ شاید نیچے کی طرف سے ٹوٹا ہوا تھا اور اس درز سے لٹنی ٹھنڈی ہوا اسے کپکپائے دے رہی تھی۔ شیلف میں ڈھیروں المیز اور گنیش پڑے تھے۔ ان میں ایک آدھ گنیش کے دوران اسے ان تصویروں میں سے کچھ ایسے اسرار ہر قیمت پہ حاصل کرنے سے جو اس کی کسلجھا سکیں۔

لیکن اس سے پہلے کیوں نہ ہو اسٹڈی میں بھی ایک نظر ڈال ہی لوں۔“ اس نے سوچا اور اسٹڈی کے دروازے میں چابی گھمائی۔ اگرچہ شناور پہلے ہی اسے آگاہ کر چکی تھی کہ اسٹڈی کی تمام کس وہ دیکھ چکی ہے اور ان میں ایسی کوئی بات موجود نہیں جو اس کی الجھن ختم کر سکے، پھر بھی وہ طائرانہ نظروں سے تمام شیلفوں اور الماریوں کا جائزہ لینے لگی۔ بلاشبہ کتابوں کی یہ کونکیشن اس کے بابا جان یا ماما کے ذوق کی عکاسی کر رہی تھی، کہیں کلاسیک انٹرش لٹریچر کا خزانہ تھا تو کہیں جدید اردو شاعری کا ذخیرہ، سیاست، تاریخ اور مذہب پہ بھی لٹریچر موجود تھا۔ ایک بند الماری کے آگے وہ رک کے کھڑی ہو گئی۔ شیشے میں

سے نظر آتی سیاہ مٹیلیں جلد والی وہ موٹی موٹی کتابیں، جن پہ کوئی نام نہیں لکھا تھا، الہمز بھی ہو سکتی تھیں اور ڈائریاں بھی۔ اس نے بے تابی سے تمام چابیاں ایک ایک کر کے اس میں گھمانے کی کوشش کی۔ لیکن بے سود۔ جھنجھلاہٹ سے اس نے ہنڈل کو کئی جھٹکے دیئے پھر مزید وقت ضائع نہ کرتے ہوئے دوبارہ اسٹوڈیو آ گئی۔

ایک کے بعد ایک الہمز کھولتے ہوئے وہ حیران ہوتی گئی۔ سوئزر لینڈ، فرانس، اسکاٹ لینڈ سے لے کر اہرام مصر، خانہ کعبہ تک کے مناظر عکس بند کیے گئے تھے۔ تاج محل سے لے کر نیا گرافال کی رفتار تک کیسرے کی زد میں تھی۔ وہ دس بارہ الہمز کھنگال بیٹھی۔ لیکن اس سے سوائے اس راز کے اور کچھ ثابت نہ ہوا کہ اس کے بابا جان نہ صرف ایک حساس مضور ہیں، ایک ماہر فوٹو گرافر ہیں، بلکہ ایک سیلانی سیاح بھی رہ چکے ہیں۔ اس نے وقت کی کمی کے پیش نظر باقی الہمز دیکھنے کا ارادہ متوی کر دیا۔ بی بی جان کے تہجد کے لیے اٹھنے سے قبل وہ یہاں سے جانا چاہتی تھی اس لیے تمام الہمز ترتیب سے رکھیں۔ ایک کے بعد ایک میلا پھیلا سا تولیہ کسی کھوٹی پہ لگا تھا۔ تولیے کا ایک کونا چند الہمز ڈھانچے ہوئے تھا۔ تجسس سے بے قرار ہو کے وہ جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اس طرف بڑھی۔ شاید کسی نے ارادتا ان الہمز کو ڈھک کے رکھا ہو، اس نے تولیہ کھینچا اور ان الہمز کا جائزہ لیا، ایک تو پھولوں کی کسی نمائش کی تھی اور دوسرے کے ٹوکوسر کرنے والے کوہ پیادوں کے کسی گروپ کی۔

اس نے سخت مایوسی کا شکار ہوتے ہوئے دھول میں اپنے اس اکرے ہوئے بدرنگ تولیے کو دوبارہ کھوٹی سے لٹکانا چاہا تو وہاں جھولتی ایک سہری چابی پہ اس کی نظر جم گئی۔ ایک زنجیر کے ساتھ دوسرے کوئے پہ دل نما کوئی چیز جھول رہی تھی، اس نے چابی اتار لی اور میکا کی انداز میں اسٹڈی میں گھس گئی، مقفل الماری میں وہ سونے کی چابی گھماتے ہی کلک کی آواز آئی اور مقدس کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔

اس کا اندازہ درست تھا۔ بابا جان کو مضوری، سیاحت اور فوٹو گرافی کے ساتھ ساتھ ڈائری لکھنے کا بھی شوق تھا۔ ایک ترتیب کے ساتھ سال بہ سال لکھی سیاہ کور والی ڈائریاں اپنے اندر اس کے ہمہ صفت باپ کے کتنے راز چھپائے پڑی تھیں۔ چوتھر، پچھتر، چھیتر سے ہوتے اس کے ہاتھ انیس سو اسی کی ڈائری پہ رک گئے۔ یہ اس کی پیدائش سے ایک سال پہلے کا سن تھا اور یہی یہاں موجود آخری ڈائری تھی۔ اس نے شمال کے اندر اسے کسی متاع عزیز کی طرح چھپایا اور جس خاموشی سے آئی تھی ویسے ہی واپس چلی گئی۔

☆☆☆

”خیریت تو ہے، بہت دیر لگا دی۔“ شناور حسب توقع اس کے انتظار میں دروازے پہ ہی تھی۔

”ایک گھنٹہ بھی نہیں لگا۔“ اس نے شمال ایک طرف پھینکی۔ وہ جس طرح ٹھنھرتی ہوئی گئی تھی، اب اتنی ہی پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔

”کچھ ملا؟“ اس نے پانی کا گلاس اسے تھمایا جسے مشکور نظروں سے تھماتے ہوئے وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔

”یہ ڈائری“ اس نے ہاتھ میں پکڑی ڈائری لہراتے ہوئے گلاس لبوں سے لگا لیا۔ شناور نے کچھ اور کہنا فی الحال مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے اپنی رائٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئی اسے نوٹس مکمل کرنا تھا۔

لحاف میں دبک کر کا پتی انگلیوں، دھڑ دھڑ کرتے دل اور پیاسی آنکھوں کے ساتھ اس نے ڈائری کھولی۔

۱۲ مئی ۱۹۸۰ء

تھکاوٹ سے جسم ٹوٹ رہا ہے اور یہ تھکاوٹ پورا ایک مہینہ گھر گزارنے کی ہے۔ پیر کے چکر کہیں تک کے بیٹھنے ہی نہیں دیتے۔ ایک مدت ہوئی گھر میں اتنا وقت گزارے ہوئے کہ زرسا نگہ باجی کی شادی، اتنے ڈھیروں کام۔ اتنی ذمہ داریاں۔ بڑے لالہ کا پہلا پیدائش تھا تو دراب کلاسٹ سمسٹر دونوں کی تمام تر توجہ اسی جانب پا کے باچا جان نے مجھ پہ نظریں لگائیں تو میں نے بھی اپنی سیلانی فطرت کو کچھ روز کے لیے تھپک کے رکھا اور اپنی اکوٹی بڑی سون کی شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بے جی، میری اپنی جان میں کتنی سگی بیٹیوں جیسا پیار رکھتی تھیں حالانکہ بی بی جان سے ان کی کم ہی بنتی تھی۔ اس سبب لالہ کے بعد ان کے ہاں دو بیٹیاں ہوئیں تو مگر زیادہ دن جی نہ سکیں اور جب بی بی جان کے پہلویشی کی بیٹی ہوئی تو بے جی نے کتنی خواہش کی تھی کہ اب ان کے ہاں بھی ایک بیٹی ہو۔ زرسا نگہ جیسی پیاری پیاری سی، لیکن میں آ گیا ان کا دوسرا بیٹا۔ پھر وہ جتنا عرصہ زندہ رہیں بیٹی کے حصے کی متا انہی پہ لگاتی رہیں، اسی لیے زرسا نگہ باجی سے میرا تعلق اور گہرا ہو جاتا ہے ان میں مجھے بے جی کی خواہش کا عکس جھللاتا نظر آتا ہے۔ کتنے پریشان رہتے تھے سب ان کے لیے، وہ خاندان جس میں سولہ سترہ سالہ لڑکی کا بن بیا ہے رکھنا ہی ممنوعہ ہو وہاں میری بہن تیسواں سال شروع ہونے تک بھی خیر۔ شکر ہے

رب العزت کا جس نے آفریدی خاندان کی نظر اس پر ٹھہرا دی۔ اس خاندان سے ہمارے اور بھی رشتے نکلتے ہیں اس حوالے سے یہ لوگ ہمارے لیے اجنبی بھی نہیں۔ اپنے ہی اپنوں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں، یہ بات بی بی جان اکثر کہا کرتی ہیں۔

رحیم گل آفریدی عمر میں زرسا نگہ باجی سے چند برس چھوٹا ضرور ہے، لیکن آفریدی اور خٹک خاندان میں اتنا کچھ ہوتا چلا آیا ہے کہ اب کچھ بھی انہونی بات نہیں لگتی۔ اب باچا جان کو ہی سمجھتے۔ ان کے والد اور والدہ دونوں اپنے اپنے بھائیوں کی بیٹیاں لانا چاہتے تھے، باچا جان نے میری بے جی یعنی اپنی چچا زاد سے شادی کے ڈیڑھ برس بعد ہی بی بی جان یعنی اپنے ماموں زاد سے بھی نکاح کر لیا اور اس کے علاوہ..... اب کیا کیا لکھوں۔ رشتوں کی ڈور میں اتنے بل ہیں کہ ایک کا ذکر چھوڑ دو دوسرا قصہ لکھ چلا آئے اسی لیے میں سارے ماحول سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ وقت خاندانی مسائل، جائیداد کی تقسیم کے تنازعے، وراثتی جھگڑے، غیرو وغیرہ میں تو بس منہ خدا آگے بدلنے سال میں دو تین بار ایک آدھ ہفتہ یہاں رہنے والا ہوں۔ اس باری کچھ زیادہ دن لگ گئے۔ کل ہی شادی کے ہنگامے ختم ہوئے ہیں اور میں سخت بوریت محسوس کر رہا ہوں۔ آج رات سونے سے پہلے یہ فیصلہ کر کے رہوں گا کہ میرا لگا پڑاؤ کون سا ہوگا۔

۱۳ مئی ۱۹۸۰ء

کل رات جب میں اپنے متوقع سفر کے بارے میں سوچ رہا تھا تو مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ مصر، لبنان اور شام سے لے کے چین، ملائیشا، نیپال تک اور فرانس، امریکہ سے لے کر سویٹزر لینڈ اور جاپان تک میں آدھی سے زیادہ دنیا گھوم چکا تھا اور ان ہی جگہوں پر دوبارہ جانے کا میرا کوئی موڈ نہیں تھا۔ میری آنکھ کیمرے کی آگ سے لکڑی ہوئی تھی۔ دیکھ لوں ذہن کی سلیٹ پر نقش ہو جاتا ہے اور میں ہو بہو اسے سینوس پہ آنکھ بند کر کے ہی اتار سکتا ہوں اس لیے کئی بار کی دیکھی جگہیں میرے لیے کسی دلچسپی کا باعث نہ تھیں۔ اسی وجہی کشمکش میں مجھے فیروز خان وردگ کی آفریاوا آئی۔

پچھلی سردیوں میں جب باچا جان کے ساتھ ان کے دوست، بسم اللہ جان کی شکار کی دعوت پہ سوات گیا تھا تو وہیں فیروز سے ملاقات ہوئی تھی۔ بسم اللہ جان والی سوات کے خاندان سے ہیں، سوات کے آخری ولی عہد کمیشن میاں گل اورنگ زیب خان ان کے والد کے قریبی عزیز تھے، اسی حوالے سے پورے سرحد اور خصوصاً آزاد قبائل کے چیدہ

چیدہ خاندانوں کے خان مدعو تھے ان میں یوسف زئی بھی تھے، شنواری اور خٹک بھی اور وردگ بھی، بعض ٹیمپل خان حضرات تھے بعض اپنے خول سے باہر آنے کی کوشش میں مصروف ان ہی میں فیروز خان وردگ مجھے چونکا گیا۔

غضب کا ذہن پایا ہے اس شخص نے، تعلیم اگرچہ اس کی رکھی ہے لیکن اس کی ذہنی اپروچ اور پختون تاریخ کے بارے میں اس کی معلومات قابل رشک ہیں، بہت کم وقت میں اچھی خاصی دوستی ہو گئی، میری اس سے۔

میرے سیاحت کے شوق کے بارے میں جان کے اس نے مجھے آفر کی تھی کافرستان وادی کیلاش کے دورے کی، اس کی زبانی وہاں کے واقعات سن سن کر میں تو تب ہی ارادہ کر چکا تھا جانے کا لیکن فیروز نے منع کر دیا کہ سردیوں میں برف باری وہاں تک کے تمام راستے مسدود کر دیتی ہے، ان علاقوں میں جانے کا آئیڈیل وقت مئی سے ستمبر تک کا ہے۔ اس سے کیا وعدہ یاد آنے پر میں نے فوراً ہی وہاں جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ کل ہی صبح فجر کے بعد میں پشاور سے سوات کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ انشاء اللہ

۱۳ مئی ۱۹۸۰ء

اس وقت میں فیروز خان کی سفید اینٹوں سے بنی حویلی کے مردان خانے کے منتقل جالی کے پاس بڑے سے گیس لیپ کے نیچے بیٹھا یہ ڈائری لکھ رہا ہوں۔ رات گئے تک فیروز کے دوستوں کی محفل جمی رہی میری آمد کی خوشی میں اور اب وہ مجھے گھنٹہ دو گھنٹہ آرام کی تاکید کرتے ہوئے گیا ہے، تاکہ صبح کا اُجالا پھیلتے ہی سفر پہ نکل جائے، لیکن میں بھلا ڈائری لکھنے لکھنے سے روک رہا ہوں۔

پول تو میں سات آٹھ بجے کے درمیان ہی سوات پہنچ گیا تھا لیکن فیروز کے گھر شام کی گھنٹوں کی رہائش سوات کے صدر مقام سیدو شریف میں ہے وہاں تک پہنچ کے اس کی حویلی جاتے ہوئے عجیب سی جھجک نے مجھے آن گھیرا درمیانی عرصے میں، میں نے اس سے کوئی رابطہ نہ رکھا تھا اور اب اچانک اسے میزبان کا شرف بخشے پہنچ رہا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے کسی ہوٹل کی راہ لینے کا فیصلہ کیا۔ سیزن ہونے کی وجہ سے سرینا، مرغزار اور پی ٹی ڈی سی جیسے پائے کے تمام ہوٹل بک تھے۔ میں نے نسبتاً درمیانے درجے کے ”ریٹیم“ میں کمرہ بک کروایا اور وہاں پہنچ کے فیروز سے رابطہ کیا لیکن وہ گرم جوش پنہان زادہ میری آواز سننے ہی دیوانہ ہو گیا۔

اور چند منٹ کے اندر اندر مجھے لینے آ گیا۔

سوات کے پُر رونق بازار گھماتا ہوا وہ مجھے اپنی حویلی لے کے آیا۔ پُر تکلف پکوانوں، خوشبودار قہوؤں کے درمیان گپ شپ لگاتے کب رات بیت گئی پتہ ہی نہیں چلا، اب مجھے تھکاوٹ سی محسوس ہونے لگی ہے۔ میرا خیال ہے کچھ دیر کمر سیدھی کر ہی لی جائے۔

۱۵ مئی ۱۹۸۰ء

اور اس وقت میں گویا جنت کے ایک قطفے پہ بیٹھا خود کو یہ یقین دلارہا ہوں کہ میں واقعی اس منظر کا ایک حصہ ہوں۔ مجھے حیرانی ہے کہ پشاور میں رہنے کے باوجود میں اپنے اس قدر قریب واقع ان حسین وادیوں سے اب تک انجان کیسے رہا، دنیا بھر سے لوگ نجانے کتنا کتنا لمبا سفر طے کر کے یہ جنت نظیر مقام دیکھنے آتے ہیں، فیروز نے بتایا۔

”سوچیان، فاحان، ساگک یون، ہیون ساگک اور اوگیان یا کے سفر نامے کی تلاش کے چپے چپے کے قصبہوں سے بھرے پڑے ہیں۔ بدھ مت کا جہک مقام بھی ہے۔ دنیا بھر سے بدھ مت کے ماننے والے یہاں اپنی مذہبی سومات کی ادائیگی کے لیے آتے ہیں۔ سوات کا ایک سابق بادشاہ ”اجی تابا“ بدھ مت کا مذہبی رہنما بھی تھا اور ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی ضرور واپس لوٹے گا وہ دن بدھ کا اور تاریخ ۲۶ ہوگی۔“

اس کے علاوہ بھی اس نے ان اطالوی، فرانسیسی اور برطانوی سیاحوں کے اقتباسات سنائے جو سوات اور کالاش سے مسحور ہو کے رہ گئے تھے۔ چنانچہ میں بھی اس وقت ڈنگ رہ گیا تھا، جب سید و شریف سے تقریباً سو کلومیٹر کے فاصلے پہ واقع مشہور چوٹی ”فلک سیر“ میری نگاہوں کے سامنے آئی۔ میرا تودل ہی نہ چاہتا تھا اتنی جلدی وہاں سے کوچ کرنے کو لیکن سفر طویل بھی تھا اور پرچہ و دشوار گزار بھی۔

”تم کہاں کہاں رکو گے۔ یہاں سے ایوان تک کا راستہ یوں پچھوڑوں سے لدا اور گھساروں، آبشاروں سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن اب ہمیں ایوان تک بغیر رُکے سفر کرنا ہے۔“

فیروز نے تنبیہ کی۔

”ایوان؟“ میں اپنی لائسنسی پہ خاصا شرمندہ تھا۔

”ہاں چترال سے آگے یہ سرسبز گادوں کا فرستان کا دروازہ کھلاتا ہے۔ یہاں سے ہی کیلاش کی وادیوں کو راستہ نکلتے ہیں۔“

”کیا یہ کوئی ایک وادی نہیں ہے۔“

”نہیں وادی کیلاش بمبوریٹ، بریر اور ریمور نامی تین حصوں پہ مشتمل ہے۔ تینوں کا قدیم مذہب آتش پرستی اور ناگ پرستی ہے۔ لیکن یہ لوگ تین قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں بظاہر ان کا بودو باش ایک سا ہے، لیکن بمبوریٹ نسبتاً ترقی یافتہ کہلایا جاسکتا ہے۔“ ایوان پہنچ کر فیروز نے جیب اپنے ایک جاننے والے مقامی شخص کے حوالے کی۔ ”ان راستوں پہ ڈرائیونگ صرف یہاں کے ماہر ڈرائیور ہی کر سکتے ہیں۔“

”تو اب ڈرائیور کہاں سے لیا جائے۔“ اندھیرا پھلنے کی وجہ سے میں فکر مند تھا۔

”چلو اڈے چلتے ہیں، وہاں دن میں ایک دو بار وینگن آتی ہے اور مسافر بھر کے دو باش“ لے جاتی ہے۔“ اڈے پہ کئی سیاح گروپ بنائے کھڑے تھے، کچھ ہی دیر میں ایک بس آئی اور سب لوگ کراہیے ملا کے ڈرائیور کو دینے کے بعد اپنے اپنے سامان سمیت اس پہ سوار ہو گئے۔ فیروز کا کہنا درست تھا واقعی اس پُر خطر پہاڑی راستے پہ ڈرائیونگ کرنا انٹری شخص کے لیے ہلکی تھا۔ دو باش کے مقام پہ فیروز کا ایک مقامی دوست ڈان خان، جیب لیے کھڑا تھا۔ محنتی سا وجود، سرخ و سفید رنگت، بادامی شلوار سوٹ پہ براؤن جیکٹ سپروں سے بھری ہوئی قلمی والی روایتی ٹوپی کے ساتھ وہ خوش مزاج شخص، حد سے زیادہ مہمان نواز لگ رہا تھا۔ راستے میں میں نے آہستہ آواز میں پوچھا۔

”یارا فیروز خان، یہ بندہ ڈان خان کیا ہے؟ میرا مطلب ہے ڈان بھی اور خان بھی۔“

”یہ تو بدھ مت نام ہے تو پھر یہ خان؟“ وہ زور سے ہنس پڑا۔

”آگے آگے دیکھو، ہوتا ہے کیا۔ یہاں ایسے ایسے نام سننے کو ملیں گے کہ بس۔ یہ لوگ نکارنے کے لیے کوئی بھی نام رکھ لیتے ہیں۔ نہ مطلب کھگانے کی فکر، نہ مذہب و قوم کا خیال۔ یہاں آگے والے عجم کی سیاحوں کے نام پہ بھی یہ اپنے بچوں کے نام رکھ لیتے ہیں۔“

”وہاں ڈان خان شیخ مسلم ہے۔ یہ کیلاش کے قصبے کا رہنے والا ہے، بمبوریٹ کی کافر آبادی سے نہیں میں نے کہا ناں یہاں دو تہذیبوں کا میل ہے۔“

قصباتی لوگ اکثر تو مسلمان ہی ہیں، سکھ اور اکا دکا ہندو بھی نظر آ جاتے ہیں۔ ان کی زبانیں پشتو کے علاوہ گوجری، کوہستانی اور کشمیری بھی ہیں۔ یہ قدرے تعلیم یافتہ اور تہذیب پسند ہیں، لیکن کالام حقیقی معنی میں کافرستان ہے۔ صدیوں سے چلی آرہی اپنی تہذیب و تمدن اور مذہب میں یہ رتی بھر تبدیلی کرنے پہ تیار نہیں۔ یہ اپنا مخصوص لباس پہنتے ہیں، اشو جی اور گاروی زبان بولتے ہیں اور اپنی قوم میں کسی انقلاب اور جدت کے سخت خلاف ہیں۔ ہاں

ناموں کے سلسلے میں یہ اصول کچھ کمزور ہیں۔ یہاں کوئی ڈیوڈ ہے، کوئی رام لعل، کوئی پھول خان ہے تو کوئی گو بھی خان، کوئی سکندر ہے تو کوئی بندر۔
 ”ڈونٹ ٹیل می یار۔“ میں ہنسنے لگا۔

”ابھی دیکھنا ذرا تم“ اس نے گیٹ پہ بیٹھے چوکیدار کو پشتوں میں مخاطب کیا۔

”سنگے ایران چا چا؟“ (کیسے ہو ایران چا چا؟)

”خیر رائے“ (خوش آمدید، خوش آمدید،) وہ اس کے ہاتھ چومتا

ہوا مزاج پڑی کرنے لگا۔

”یہ کمانڈر خان ہے اور یہ اس کا بھائی جرنیل خان۔“ اس نے آٹھ سال کی عمر کے دو

جڑواں لڑکوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ شان کے بھائی پان خان کے بیٹے ہیں اور یہ ہے

بجرت کا بھائی، غضب کا ڈنکار ہاتھ ہے اس کا، انجیر نام ہے اور مسٹر جنرل کے بڑے کمال کے

ڈرائیور ہیں، یہی ہمارے گائیڈ کا کام بھی کریں گے۔“

اس نے فرد افراد ان سب دلچسپ ناموں والی کٹیوں کا تعارف دیا اور ہر نام بجز

میں چلے آئے۔

رات کے سائے پھیل رہے تھے، لیکن تاریکی اس حلقہ کو میری نظر سے پوشیدہ نہیں رکھ

سکتی جو صبح کے پہلے اجالے کے ساتھ میرے حواسوں پہ چھانے والا ہے۔

۱۶ مئی ۱۹۸۰ء

وادی کیلاش میں آج صبح کی پہلی کرن کے ساتھ بیدار ہونے والا میں پہلا شخص تھا یا

شاید میں تو سورج کے طلوع ہونے سے بھی پہلے ہی حجرے کے کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

نیلگوں تاریکی میں پو پھٹنے تک میں حجرے کے احاطے میں موج و مجلس گھاس

وہاں کی فرحت افزا اور خوشبوؤں بھری فضا کی تازگی اپنے اندر اپنے جذبہ ہاں

فیروز کے سونے کے انداز سے تو ظاہر ہوتا تھا وہ اور دو تین گھنٹے تک جاگنے کے موڈ میں

نہیں۔ میں اسے جگاتے جگاتے رہ گیا، یہی کم تھا کہ وہ دوستی اور میزبانی کے تقاضے نبھاتے

ہوئے میرے ساتھ یہاں تک چلا آیا تھا۔ اپنے کاروبار اور بیوی بچے کو چھوڑ کر، مجھ جیسے ہر

ذمہ داری سے آزاد، بے فکرے سیاح کا ساتھ دینے کے لیے۔ اتنی صبح صبح اس کی نیند خراب

کرنے کا ارادہ میں نے ترک کر دیا۔ ایران چا چا بھی شاید رات بھر کی چوکیداری کے بعد

اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا۔ دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔

مرغ کی کڑک دار بانگیں پر سکون فضا کا سینہ چیرے دے رہی تھیں۔ مرغ کی آواز کے ساتھ ہی مجھے سید و شریف میں گزاری رات یاد آ گئی۔ جب فیروز خود بھی حلق تک بھنی مرغی ٹھونس رہا تھا اور مجھے بھی بے تحاشا کھانے پہ مجبور کر رہا تھا۔ جب میں نے اسے ٹوکا کہ ”کیا آج سے پہلے کبھی مرغی نہیں دیکھی، یا آج کے بعد دیکھنے کو نہیں ملے گی کیا، جو دیگر پکوان چھوڑ کر بے چاری مرغی کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہو۔“ تو اس نے ایک دلچسپ انکشاف کیا تھا۔

”کیلاش میں باورچی، نائی اور چوکیدار وہاں کی مقامی آبادی کے ہوتے ہیں اور

کافرستان کے مذہب میں مرغ حرام ہے۔ اس لیے کسی کیلاش باورچی کے ہاتھ میں مرغ

پکانے کے لیے دینا گویا اس کی مذہبی عقیدت پہ وار کرنا ہے اس لیے خوچہ جتنی مرغی کھانی ہے

آج ہی کھا لو نجائے اور کتنے بچے ڈبے اور ٹھنیں کھانی پڑیں۔“

اس کا تندیہ سن کر میں نے مرغی پہ مرغی اڑانا یاد کر کے میرے لبوں پہ مسرت آ گئی۔

دور کہیں سے فجر کی اذان سنائی دینے پر میں لکڑی کا پھانک کھول کے سرمنی پتھروں والی گلی

میں آ نکلا۔

سامنے ڈھلان کی جانب سے ایک سیاہ پوش وجود بغل میں گھڑوچی دبائے قدم بہ قدم

آ بھر رہا تھا۔ ٹی وی یا میگزینز میں کلام کے اس روایتی لباس اور زیور کے ساتھ کئی بار وہاں کی

دو شیرازوں کو دیکھ رکھا تھا لیکن..... پہلی بار ایک کالا شہرہ کو آتے دیکھ کے میرے قدم خود

بجھوڑ گئے۔ وہ بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتی میرے مقابل آن کھڑی ہوئی۔ گلجے سے اُجالے

اور ہلکی ہلکی زاحند میں اس کے نقوش واضح نہ تھے۔ لیکن قد اور سراپا مکمل خود اعتمادی کے ساتھ

میرے سامنے تھا۔ اس کے لبوں سے چند ناقابل فہم الفاظ والا ایک جملہ نکلا تھا شاید اس نے

اپنی مقامی زبان میں گھڑوچی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا تھا۔ میں احمقوں کی طرح

دیکھنے لگا۔ لڑکی سمجھ دار تھی، میرے کچھ کہے بغیر ہی سمجھ گئی اور اب کے پشتوں میں مخاطب ہوئی۔

”بکری کا تازہ دودھ ہے صیب، کتنا لوگے؟“ اپنی مادری زبان میں اسے بولتے دیکھ

کے مجھے عجیب سے احساسات نے آن گھیرا۔ پوری دنیا گھوم چکا تھا میں، مختلف ممالک میں

بھانت بھانت کی لڑکیوں سے واسطہ پڑا تھا مجھے، بھنورا صفت یا رنگین مزاج کہنا تو کس طور

جائز نہ ہوگا۔ بہر حال صیب نازک سے قطعی پرہیز مجھے بھی نہیں رہا۔ اٹلی کی سلویا اور قاہرہ کی

نجواسے میری اچھی خاصی دوستی رہی، لیکن کیا کیا جائے رگوں میں اُلٹے اس خون کی تاثیر کا۔

میرے اندر کا پختون زادہ اپنی فضاؤں میں آ کے پورے کروفر سے سر اٹھالیتا تھا۔ اپنی برادری اور خطے کی خواتین کو سامنے پا کے میں کبھی بھی بے تکلفانہ گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔

ہمارے خاندان میں فرسٹ کزنز سے بھی عمر کے ایک حصے میں آ کے پردہ کر لیا جاتا ہے۔ حویلی کے زنانہ اور مردانہ حصوں کے ملازمین تک کے سلسلے میں احتیاط کی جاتی ہے۔ جس طرح ہمارے زنان خانے میں مرد ملازم کا جانا محال ہے، اسی طرح بی بی جان مردان خانے اور حجرے میں گھریلو ملازموں کا جانا بھی پسند نہیں کرتیں اور اب سحر کی اس اولین ساعت میں، دور دور تک پھیلے سنائے اور تنہائی میں ایک لڑکی کو خود سے ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر اپنی مادری زبان میں خود سے مخاطب پا کے میں ایک لمحے کے لیے بھول ہی گیا کہ وہ ایک غیر قوم، غیر مذہب لڑکی ہے قصداً ذرا سا ایک جانب ہوا کے میں نے اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اندر جا کے گھر کی خواتین سے پوچھ لو۔ اس کے گھر وچھی سمجھاتے ہوئے اندر کی طرف قدم بڑھایا اور ایک ٹوالتی ہوئی مگر سرسری سی نظر بچھریہ ڈال۔ نصب کا اعتماد تھا اس کی بے پرواہ چال میں۔ میں آگے ہستی کی طرف بڑھ گیا۔ دو گلیاں پرے ایک کچی مسجد میں فجر کی نماز ادا کی اور ٹہلتا ہوا واپس آ گیا۔

ناشتا ڈان خان کے گھر کے اندرونی حصے میں ہوا۔ میں گھر کے پختونین کی موجودگی میں کچھ ان ایزی فیل کرتا رہا، لیکن شاید ڈان کی ماں، بہنیں وغیرہ سب فیروز سے خاصی بے تکلف تھیں۔ وہ پشتو نہیں جانتی تھیں اور میں ان کی زبان سے نابلد، البتہ فیروز نے پچھلے الفاظ، کچھ ہاتھ کے اشاروں کے ذریعے اور کچھ ڈان کے بھتیجیوں کمانڈر اور جرنیل کی مدد سے مسلسل شامل گفتگو رہا۔ ناشتے کے دوران کیلاش ملازموں نے اندر آ جاتی تھیں اور دسترخوان بچھانے، کوئی گرم روٹی پیش کرنے۔ ایک وہیں بیٹھی پھل کاٹ رہی تھی۔ اور دو چار نو عمر لڑکیاں کونے میں لگیں کھسر پھسر اور کھی کھی کر رہی تھیں اور فیروز کے فقروں پر کھٹکھٹاتی رہی تھیں۔ اس نے میرا گریز بھانپ کے مجھے گفتگو میں شریک کرنا چاہا۔

”یارا زریاب تو ان کے نام نہیں پوچھے گا۔ ذرا دیکھ تو سہی حسن و شباب کے ان شاہکاروں پہ لبیل کیا کیا لگے ہوئے ہیں۔“ میں نے مسکرا کے ٹالنا چاہا، مجھے خواتین کو یوں تحقیر بھرے انداز میں موضوع گفتگو بنانا پسند نہ تھا پھر چاہے وہ کوئی آن پڑھ، گھریلو ملازمہ یا کافر پہاڑن ہی کیوں نہ ہو، لیکن شاید وہ لوگ بھی ان دو شیرازوں کے ساتھ چھیڑ چھا کے عادی

تھے اور وہ بھی ان صاحب لوگوں کے ساتھ خاصی گھٹلی ہوئی لگ رہی تھیں۔

”یہ دیکھو سب سے پہلے تمہارا تعارف ”غٹ ٹنڈے“ سے کراتا ہوں۔“ اس نام پہ میں نے بے ساختہ سر اٹھا کے سامنے دیکھا اور اس مسکراتی ہوئی اجڑی لڑکی کو دیکھ کے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کر سکا۔ جس نے بھی یہ نام رکھا تھا بڑا ہی ”برجستہ“ رکھا تھا۔ اس کے چہرے پہ کوئی چیز اگر نمایاں تھی تو وہ عنابی رنگ کے خاصے بڑے بڑے ہونٹ تھے جو پہلے دانتوں کو خاصی حد تک ڈھانپے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں بلاشبہ بے حد شفاف اور معصوم سی تھیں لیکن لمبے لمبے پیلے دانتوں اور مونے لٹکے ہوئے ہونٹوں کا کبھی نیشن اس کی آنکھوں کا حسن عارت کر رہا تھا۔ ”غٹ“ پشتو میں بڑا کو اور ”ٹنڈے“ ہونٹ کو کہا جاتا ہے یعنی کسی پختون دان نے اسے یہ نام دیا ہوگا اور اس کے ماں باپ نے بغیر مطلب جانے اسے تمنے کی طرح اس بے چاری پہ سجا دیا۔

”اور یہ ہیں مس لندن“ اس نے بارہ تیرہ برس کی دہلی پتلی سی شرمیلی بچی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور ایک مس پیرس بھی ہوتی ہیں وہ آج اتفاقاً غیر حاضر ہیں۔ یہ نام یہاں آنے والے غیر ملکی سیاحوں سے متاثر ہو کر رکھے گئے ہوں گے۔ بے تکلف ہونے میں تو یہ کوئی کمال رکھتی ہے۔ بنا زبان سمجھے جانے یہ ہر ملک سے آنے والے لوگوں سے کھل مل جاتے ہیں۔ انہیں اپنی تقریبات میں مدعو کرتے ہیں اور بدلے میں اور کچھ نہیں تو ان کے لئے نام تو مل ہی جاتے ہیں اور یہ..... یہ دیکھو۔“

اس نے سوئی ہوئی غلافی آنکھوں، بھرے بھرے گالوں اور سونے کی سی رنگت والی ایک دو سالہ بچی کی انگلی تھام کے آگے کیا۔

”کیا اہتہ دیکھ کے قدرت کی فیاضی پہ ایمان لانے کو جی نہیں چاہتا؟ لیکن جانتے ہو اس کا نام کیا ہے؟ غریبی“ میں نے نظر بھر کے اس بچی کو دیکھا۔ کون سا رنگ تھا فطرت کا جو خدا نے اس کے چہرے پہ سجا نہیں دیا تھا۔ سبز آنکھیں، گلابی ڈورے، سرخ گال، مرمریں ہونٹ، بھورے بال، سنہری جلد اور نام غریبی میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔ میں نے جیب سے ایک پانچ سو کا نوٹ نکال کے بچی کے مٹی سے سنے ہاتھ میں تھمایا اور کہا۔

”اس کا نام ”انمول“ ہے۔ اس کی ماں سے کہہ دینا۔“ اور اٹھ کے باہر نکل آیا۔ کنویں کے پاس ”کپے“ میں ایک اور سیاہ پوش لڑکی بیٹل کی گھڑوچی کھٹکال رہی تھی مجھے یونہی شبہ سا ہوا کہ یہ وہی صبح والی لڑکی ہے۔ ذرا قریب جا کے میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔ اگرچہ صبح کے

دھندلکے میں اس کے نقوش نہیں دیکھ پایا تھا لیکن مدھم سُروں میں گنگنائی اس کی آواز میں فوراً پہچان گیا۔ میرا ارادہ اچاٹے سے گزر کر سامنے ایران چاچا کے پاس جا کے گپ شپ لگانے کا تھا کہ وہ واحد بلازم تھے جو پشتوبول سکتے تھے، لیکن نجانے کیوں میرے قدم اس کے قریب آ کے رک گئے۔

”اور تمہارا نام کیا ہے؟“ اچانک میں نے اپنی آواز سنی۔ اس نے ذرا سا سر اُٹھایا کر کے نظر مجھ پہ ڈالی۔ گھڑوچی سے پانی جھاڑا، گیلے ہاتھ اپنے گھیردار کرتے سے پونچھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مومنہ علی“ پُر اعتماد لہجے میں جواب دیتی ہوئی وہ آگے کو قدم بڑھا گئی اور میں جو کسی عجیب و غریب نام کا منتظر تھا۔ مومنہ علی سُن کے ذہن گھبرا گیا اور جہاں کا تھاں کھڑا اس نام پر غور کرتا رہا۔

”کیا ہوا؟ کہاں گم ہو؟“ فیروز میرے نزدیک چلا آیا۔
”کچھ نہیں، یار مذاق سے قطع نظر یہ لوگ واقعی بامِ رکشہ کے سلسلے میں بہت لا پرواہ لگتے ہیں۔“ میں بڑبڑایا۔

☆☆☆

”مومنہ علی“

مقدس کی نظریں پھر سے دو سطریں اوپر پھسل کر ”مومنہ علی“ پہ پڑ گئیں۔ اس نے تیز لب یہ نام دہرایا۔

”اللہ اکبر..... اللہ اکبر“

فجر کی اذان کی آواز ماحول کے ہر احساس پہ حاوی ہو گئی۔ اسے شروع ہی سے صبح صادق کے طلوع اُجالے میں اذان سننا بے حد اچھا لگتا تھا۔ بابا جان کو بھی تو وہ..... مومنہ علی فجر کی اذان کے سے..... اور اب مجھے بھی، اس وقت اس کی ذہنی رد بھٹک کر پھر وہیں چلی گئی تو سر جھٹک کے وضو کو نے کھڑی ہو گئی۔ نماز ادا کر کے اس نے دُعا کے لیے ہاتھ بلند کیے۔ آج سے پہلے اس نے خود کو کبھی اتنا جی دست نہ محسوس کیا تھا، یہاں تک کہ دُعا مانگنے کے لیے اس کے کھنکول میں الفاظ کے سکتے بھی نہ تھے۔ وہ کیا مانگتی۔

ماں باپ کی سلامتی اور ان کی لمبی عمر کی دعا۔

یا۔

پھر ان کی مغفرت کے لیے۔

”نہیں، نہیں۔“ وہ لرز گئی۔ ”یا اللہ میں نہیں جانتی میرے ماں باپ کہاں ہیں اور کیوں ہیں، وہ کیا وجہ ہے جس نے انہیں مجھ سے غافل ہو کر اپنی اپنی زندگی الگ الگ گزارنے پہ مجبور کر دیا ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ مجھے ان سے لاعلم رکھنے میں تیری کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔ لیکن یا مسبب الاسباب مجھے ایک بار صرف ایک بار ان سے ملو اڑے۔ میں ایک بار..... زندگی میں صرف ایک بار ان کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھنا چاہتی ہوں، ایک بار ماں کی آغوش کی گرمی محسوس کرنا چاہتی ہوں، ایک بار اپنے سر پہ باپ کے ہاتھ کا سایہ محسوس کرنا چاہتی ہوں۔“

میں جانتا چاہتی ہوں وہ ٹھنڈک کیسی ہوگی جو ان ہاتھوں تلے پھیلی چھاؤں میں ہے۔ میں جانتا چاہتی ہوں وہ گرمی کتنی پرسکون ہوگی جو ماں کی پھیلی ہوئی بانہوں کی پناہ میں ہے۔ میں جانتا چاہتی ہوں کیا پاتے لیوں کا وہ بوسہ کتنا حیات بخش ہوتا ہوگا جو اولاد کے ماتھے کا مقدر بنتا ہے۔ یا اللہ تو سب جانتا ہے..... کیا میرے ماتھے کے نصیب میں وہ بوسہ ہے؟ یا اللہ رحیم و کریم پروردگار بس ایک بوسہ ذرا سی گرمی تھوڑی سی چھاؤں میرے نصیب میں بھی۔“

رات بھر کی جاگی آنکھیں خدا کے حضور گریہ زاری کے بعد اتنی متورم ہو گئیں کہ اسے انہیں مزید چند سیکنڈ کھولے رکھنا بھی دشوار ہو گیا۔ دل میں برسوں سے دبی خواہشوں کو جب وہاں کے ذریعے رست ملا تو زور و جوش تک شانت ہو گئی۔ اس نے مُندی آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کی۔

”ہیلو کزن ویک اپ“

شناور نجانے کب سے اسے آوازیں دے رہی تھیں۔ اس نے پلکیں کھولنے کی کوشش کی۔ سوجی سوجی آنکھوں سے گھٹنوں کے بل کارپٹ پہ بیٹھی شناور کو خود پہ تشویش سے جھٹکے پایا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے نیم غنودگی کے عالم میں نکلتی کچھ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”اٹھیے محترمہ، گیارہ بج رہے ہیں..... بہت سولیا۔ اس طرح راتیں جاگ جاگ کے اور دو پہر چڑھے تک سونے کی عادتیں پکی کر لیں تو بڑی پرابلم ہو جائے گی۔ واپس تو ہاسٹل میں جانا ہے ناں، اب چھٹیاں ہی کتنی باقی رہ گئی ہیں۔“

اس کے اتنا کہنے پہ مقدس کو یہ یاد آیا کہ وہ ہاسٹل کے کمرے میں نہیں بلکہ پشاور میں موجود ہے۔ اس نے بازوؤں پہ رکھا سر اٹھا کے اٹھنے کی کوشش کی تو کراہ نکلی گئی۔ کئی گھنٹے ایک ہی پوزیشن میں سونے کی وجہ سے گردن اور شانے کے پٹھے کھینچ سے گئے تھے اور کلائیوں تک ہاتھ سن ہو چکے تھے۔ نماز کی چادر اسی طرح سر کے گرد لپیٹی تھی اور یہ کسل۔۔۔ یہ بھینٹا شانوں نے ہی اُڑھایا ہوگا۔ وہ مسکرائی۔

”سنو، کچھ خاص بات پتہ چلی ڈائری سے۔“ اسے کھڑکی کے پاس روشن دُھوپ میں قدرے ہشاش انداز میں کھڑا دیکھ کے شنوار نے پوچھا۔

”ابھی تک تو نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بیڈ پہ آ کے بیٹھ گئی۔ ”میرا خیال ہے میں نے فضول اتنے گھنٹے برباد کیے۔ یہ تو ڈائری کم اور کوئی سفر نامہ زیادہ لگ رہا ہے۔“

”وہاں اور بھی تو ڈائریاں ہوں گی۔“

”ہاں لیکن مجھے یہ اس لیے متوجہ کر گئی کہ ایک تو یہ میری پیدائش سے ایک ڈیڑھ سال ہی پرانی ہے، یعنی تقریباً اس دور کی جب بابا جان نے میری ماما سے شادی کی ہوگی یا کرنے والے ہوں گے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ ان کے ہاتھ کی لکھی اب تک کی آخری ڈائری ہے اس لیے میں نے سوچا تھا کہ اس میں لکھے حالات و واقعات ضرور ان حقائق سے پر وہ اٹھا دیں گے جو اب تک میری نظر سے مخفی ہیں، یاد رکھے گئے ہیں لیکن۔۔۔۔۔“

اس نے ڈائری کے اوراق بے دلی سے پلٹے۔

”اس میں تو سوات، کالام اور نجانے کن کن وادیوں کے قصیدے لکھے ہوئے ہیں۔ گھساروں، آبشاروں، ندی نالوں کے تذکرے وغیرہ وغیرہ۔“ اس کے لہجے میں مایوسی تھی جسے جھٹک کے وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔

”ویسے ایک بات ہے یاد۔۔۔۔۔ بابا جان میں ایک اچھا راز بتاؤں گی۔“

صلاحیتیں موجود ہیں۔ جو بات میں جاننا چاہتی تھی اس کا اس ساری تحریر سے کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود میں کس طرح گھنٹوں اس کے مطالعے میں مصروف رہی یہ میں بھی نہیں جانتی۔ انہیں تو مقصود ہونے کے بجائے مصنف ہونا چاہیے تھا۔“

”تمہارے بابا جان آرٹسٹ ہیں اور آرٹ کے کسی بھی ایک شعبے سے تعلق رکھنے والا شخص دوسرے فنون لطیفہ سے نااہل نہیں رہ سکتا۔ میں نے ماموں کے پینٹ کیے ہوئے لینڈ اسکیپ بھی دیکھے ہیں اور وہ خوب صورت لمحات بھی جو انہوں نے کمرے کی آنکھ سے قید

کیے ہیں اور یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ انہیں خوب صورتی اور وہ بھی فطری خوب صورتی بہت اٹریکٹ کرتی ہے۔ لازمی سی بات ہے کہ اس کا اظہار ان کی تحریر میں بھی ہوتا ہوگا۔ جس خوب صورتی کو وہ موقع کے ذریعے نہ ابھار سکتے ہوں گے اسے قلم کے ذریعے خراج تحسین پیش کرتے ہوں گے، لیکن تم یہ باتیں کیا جانو۔۔۔۔۔ اک آرٹسٹ کی فیلنگز دوسرا آرٹسٹ ہی جان سکتا ہے۔“ اس نے شوری دکھائی۔

”اچھا اب یہ فن اور فنکاری چھوڑو اور میرے لیے کچھ ناشتے کا بندوبست کرو۔ سخت بھوک لگی ہے۔“

”بہت اچھے۔۔۔۔۔ مقدس خانم بہت اچھے۔۔۔۔۔ مجھے کیا اپنی کنیز خاص سمجھ رکھا ہے۔ رات کو تمہاری دیگرگوں حالت پہ رحم کرتے ہوئے گاٹی کا کپ کیا لاتھمایا اور صبح یہاں کارپٹ پہ سکرے سے دیکھ کے کبل کیا اُڑھا دیا تم نے مجھے اپنی خادمہ ہی تصور کر لیا۔ چلو اٹھو خانم۔۔۔۔۔“

اور اپنی پیٹ پوجا کا انتظام خود کرو، مجھے آج یہ نوٹس مکمل کرنے ہیں۔“ وہ اسے جھاڑتی پھر سے قائل پھیلا کے بیٹھ گئی۔ اسے جب ہی مقدس کو تاناؤ دلانا ہوتا وہ اسے ”خانم“ کہہ کے چھیڑتی۔ لیکن آج چڑنے کے بجائے وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی تو شنوار نے مڑ کے اسے دیکھا۔

اور کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔ رات وہ جس حالت میں کمرے میں آئی تھی وہ حالت ایسی ہرگز نہیں تھی کہ اس کے سنبھلنے میں اتنا کم وقت لگتا۔

”لیکن اگر وہ خود کو ناٹل ظاہر کرنے کے لیے اتنی فریض نظر آرہی ہے تو مجھے بھی اپنے

گھساروں کی الحال جھٹک دینا چاہیے۔ کیا پتہ میرے استفسار پہ وہ پھر سے بکھر جائے اور

میرے دل پر جب تک وہ خود نہ بتانا چاہے گی میرے پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ کل باچا جان کے

کمرے میں کیا ہوا تھا اس کے رات سے دوسو سو، اندیشوں اور سوالوں سے گھرے دل کو

ناشتے کی ٹرے لے کے بچن سے نکلتے ہوئے اس کی نظر باچا جان کے کمرے کی طرف

اٹھی اور اس کے قدم ہٹم گئے۔ ذہن پھر سے اس بند کمرے میں ہونے والی پُر پیچ گفتگو کی طرف چلا گیا۔ اسی لیے وہ نیچے آنے سے کترارہی تھی۔ وہ کم از کم آج کے دن پھر سے اپنے

دل و دماغ کو اس پینلی میں نہیں الجھنا چاہتی تھی۔ وہ دل و دماغ جو خدا کے حضور اپنا مقدمہ پیش کر کے سبک سے تھے۔ اس نے بدقت قدم اٹھائے اور سیڑھیوں کی جانب بڑھی۔

”آپ کچھ بھی کہیں بی بی جان، باچا جان، اچھا نہیں کر رہے۔ انہیں اور کچھ نہیں تو

درباب کی کم از کم یہ بات تو مان لینا چاہیے کہ وہ زریاب کے آنے تک اپنا فیصلہ ملتوی کر دیں۔
اب تو وہ آنے ہی والے ہوں گے، نطاشہ کے بابا کا تو یہی کہنا ہے۔“ چچی جان کے کمرے
سے آتی تائی جان کی دہنگ مگر جھنجھلائی آواز نے اسے پھر سے رُک جانے پر مجبور کیا۔
”اللہ کرے، ایسا ہی ہو..... زریاب بچہ ساتھ خیریت کے اپنے گھر لوٹے
اور..... اور..... سب ٹھیک ہو جائے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو ہی جائے گا..... سب ٹھیک
جائے گا۔“ بی بی جان کی ”شکر آواز سنائی دی۔

”اللہ کرے.....“ تائی جان نے تائید بھرا ہنکارا لیا پھر دبے لفظوں میں کہنے لگیں۔
”ویسے میں نے سنا ہے مردوں سے کہ زریاب کو یہاں آنے میں خطرہ ہی خطرہ ہے،
وہ سو سال بعد بھی آئے تو فیروز خان کے لوگ اسے زندہ تو چھوڑیں گے نہیں۔“
”اللہ نہ کرے..... خیر کی بات کر رہی بی بی..... خیر مانگو خدا سے۔“ بی بی جان نے دامن
کے انہیں گھر کا اور وہ جو خود کو ان سب مذاکرات سے بے نیاز خانہ کرنے کی کوشش کرتے
ہوئے آگے بڑھنے پر آمادہ کر رہی تھی۔ فیروز خان کے نام پر تاپا ہل کے گھر
فیروز خان..... فیروز خان وردگ..... یہ تو وہی بابا جان کے سوات والے دوست
ہیں جن کا تذکرہ ڈائری میں ہے۔ اس نے تمام حواس مجتمع کر کے دروازے کے پیچھے سے
آنے والی آوازوں کی طرف متوجہ کیے۔

”میں تو یونہی ایک بات.....“ تائی جان منمنائیں
”پھر بھی گل بھابھی آپ کو سوچ سمجھ کے بات کرنی چاہیے۔“ چچی جان کے لہجے میں
خفگی تھی۔

بی بی جان کی دبی دبی سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں۔
”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔ یہاں بھی خطرہ ہی خطرہ ہے۔ یہ وردگ بھی ہمارے طرح
دشمن دار لوگ ہیں۔ نسلوں تک بدلے کا زہران کے ذہن سے نہیں اُترتا۔ اللہ میرے بچے کو
اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ کیا اب میں اس کے یہاں آنے کی دُعا بھی نہ کروں؟“ بی بی
جان کا پھلتا اور بھیکا لہجہ اس کے لیے نئی چیز تھا۔ وہ بھاری ہوتے وجود کو آگے گھسیٹ لے گئی۔
فیروز خان وردگ بابا جان کا عزیز تر دوست یا خون کا پیاسا دشمن۔ اس سوال کے
جواب کی طلب نے اسے ایک بار پھر وہی ڈائری کھولنے پر مجبور کر دیا۔

☆☆☆

۷ مئی ۱۹۸۰ء

مئی کا مہینہ یہاں کا سب سے خوش گوار مہینہ ہے اور اسی مہینے میں وہ جشن بہاراں منایا
جاتا ہے جس کی اکثر بھٹکیاں ٹی وی پروگرامز میں دکھائی جاتی ہیں۔ آگ کا بڑا سا الاؤ جس
کے گرد خوشی سے دھکتے چہروں کا سادہ مگر منظم رقص۔ جب فیروز نے بتایا کہ ہم لوگ بھی کل
رات ہونے والے اس جشن میں مدعو ہیں تو میں بے حد ہڈ جوش ہو گیا۔ آج صبح ہی فیروز مجھ
سے اجازت لے کر ایک دن کے لیے آگے کسی قصبے میں اپنے والد کے کسی دوست کی عیادت
کے لیے چلا گیا۔ مجھے اور تو کیا اعتراض ہو سکتا تھا، لیکن میں نے اسے کل تک ہر حال میں
واپس لوٹنے کی تاکید کی۔ میں جشن میں اس کے بغیر شرکت نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اس
کے حوالے سے، اس کے مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔

آج کا سارا دن میں نے بمبوریٹ کے اونچے نیچے راستوں پہ بھٹکتے ہوئے گزارا،
ایران چاچا میرے ہمراہ تھا۔ میں نے وہاں کاروائی قبرستان بھی دیکھا۔ ایک کھلا سا میدان
میں میں ٹوٹی ہوئی چار پائیاں، شکستہ استخوان اور بڑے بڑے ہوئے تابوت ہیبت ناک ماحول
پیدا کر رہے تھے۔ ایران چاچا ہاتھ لگا۔

”یوں تو ہمارے ہاں مردے کو تمام آخری رسومات ادا کرنے کے بعد چار پائی سمیت
یہاں ڈال دیتے ہیں، لیکن کچھ صاحب حیثیت لوگ اب تابوت بھی بنانے لگے ہیں، مردے
کے ساتھ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق خوراک بھی رکھی جاتی ہے۔ فرشتے جب مردے کے
پاس آتے ہیں تو وہ ان کی تواضع کے لیے یہ خوراک پیش کرتا ہے۔“

”کیسی جانوروں، چیلوں اور گدھوں کی نوج کھسوٹ اور بربریت کی نشانیاں وہاں
صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے جبر جبری لی اور آگے چل پڑا۔
مردوں کے نو لے کے نو لے رہیوں کی چنگیریں اٹھائے، سر پہ پھل کے نوکرے
رکھے، جنگل کی طرف نکل رہے تھے۔

”چاچا تم تو کہہ رہے تھے جنگل کے اندر کا حصہ بہت خطرناک ہے، ہر طرح کا زہریلا
سانپ اور خونخوار جانور اندر موجود ہے، پھر یہ عورتیں پکنک منانے وہاں کیوں جا رہی ہیں۔“
میرے سوال پر چاچا الجھا۔

”پکن، کنگ؟ وہ کیا نکلا ہے؟..... بچہ یہ تو ملوٹ دیوتا کی خدمت میں کھانا پیش کرنے
جا رہی ہیں۔ کل تہوار ہے ناں، ہر تہوار میں دیوتا کی دعوت کے لیے کھانا جنگل میں پھینک دیا

جاتا ہے۔“

”بڑے پیٹو دیوتا ہیں تمہارے۔“ میں بڑبڑایا۔

”وہ دیکھو، تمہارا قبر۔“

میں ایک شفاف جھیل کے کنارے اونچے سے پتھر پہ بیٹھا ٹھنڈے پانی سے وضو کر رہا تھا جب چاچا کی پاٹ دار آواز پہ چکنے پتھر سے پھسلنے پھسلنے بچا۔ میں نے مڑ کے اسے دیکھا، شاید اس کے دیوتا کی شان میں گستاخی کرنے کی پاداش میں میرا قتل کا منصوبہ تیار ہو گیا ہو، لیکن اس کے تاثرات نارمل ہی تھے۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں میں نے ذرا سا اچک کے دیکھا۔ کچھ فاصلے پر..... چناروں کے سائے میں ایک اکیلی قبر تھی۔ قبر کچی تھی مگر اس کے گرد پتھر لگا کے گویا حد بندی کر دی گئی تھی، اوپر چکنی مٹی کا لپ بھی تھا۔

”اوہ۔“ اب میں سمجھا۔ کسی مسلمان کی قبر تھی جسے وہ میری قبر بنانا تھا۔ ”تمہیں اللہ سمجھے چاچا۔“ میں نے غصے سے اسے غوراً غور دیکھا۔ اس حسین وادی کے سرسبز قطعے پہ پھولوں کی سڑ میں پہ سجدہ کر دیتے ہوئے کچھ عجیب سا لطف اور سکون محسوس ہوا۔ یہ سچ ہے کہ فطرت آپ کو خدا سے اور قریب کر دیتی ہے۔ چہرے کو چھو کے گزرتی بدلیاں بدن میں جھرجھری پیدا کر دیتی ہیں۔ سلام پھیرتے ہوئے میری نظر پھر اس قبر پہ پڑی نجانے میرے دل میں کیا آیا کہ چند لمحوں بعد میں اس قبر کے سرہانے کھڑا فتح پڑھ رہا تھا۔ بڑھ کے ایک بڑا سا گھنٹہ لگا ہوا تھا اور اس کی پتیاں قبر کے سرہانے پھیلا دیں۔ واپس پلٹتے ہوئے ایک سرشاری کی کیفیت مجھ پہ چھائی ہوئی تھی۔

۱۸ مئی ۱۹۸۰ء

مجھ سے وعدہ کرنے کے باوجود فیروز آج نہیں لوٹا۔ میں سخت جھنجھلا رہا تھا۔ اس جشن کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے کمرے میں قید کرنے کے لیے بے چین تھا اور اب فیروز غائب تھا۔ موسم کی خرابی مجھے اس کی بے بسی کا یقین دلارہی تھی کہ یقیناً سارا دن چلتی تیز آمد حیاں اسے سفر کرنے سے روکتی ہوں گی اور شام کے بعد تو ان علاقوں میں سفر کرنا یوں بھی ناممکن ہوتا ہے۔ پھر بھی مجھے رہ رہ کے اس پہ غصہ آ رہا تھا۔

میں اکتایا ہوا سا چار پائی پہ سیدھا لینا چھت کی کڑیاں گن رہا تھا۔ ساتھ ساتھ اپنی جس سماعت اور جس شامہ سے کام لیتے ہوئے کڑھ کڑھ کر وادی میں ہونے والے جشن کی گہما گہمی محسوس کر رہا تھا۔ کھلی کھڑکی سے اونچے اونچے سروں میں اجنبی زبان والے گیتوں کی مدھم

مدھم آوازیں آرہی تھیں۔ الاؤ کا دھواں فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ جلتی لکڑیوں کی کڑوی خوشبو، چاول دم لگنے کی اشبا انگیز مہک کے ساتھ ساتھ چربی پکھلنے کی ناگواری بدبو بھی آرہی تھی۔ اچانک کمرے کے دروازے پہ زوردار دستک ہوئی یہ اچانک اور زوردار دستک ایران چاچا کی مخصوص تھی۔ میں نے بے دلی سے اسے اندر آنے کو کہا۔ اس کے ساتھ ساتھ چند اور مقامی لوگ بھی زور زور سے بولتے چلے آئے۔

میں پھرتی سے اُنھ بیٹھا۔ ان کے انداز سے غصی اور اپنائیت بیک وقت عیاں تھی۔ ایران چاچا نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”صیب، یہ لوگ بہت سخت خفا ہیں۔ تم نے ان کی دعوت کو قابل توجہ نہیں سمجھا، اس لیے تم صرف فیروز خان صیب کے مہمان نہیں پوری وادی کے مہمان ہو اور وادی کا کوئی مہمان یوں اکیلا پڑا ہو تو کیا خاک چھوڑا ہوگا۔ بھلا کیا جشن منائیں گے ہم لوگ۔ خان صیب نہیں تو کیا ہوا تم ہم لوگ کے ساتھ چلو، اگر کوئی کسر وہ گئی تمہاری خاطر میں تو فیروز خان صیب سے کہہ کر سو جوتیاں لگوا لینا۔“

اس کے استحقاق پہ میں مسکرا دیا اور مزید غرے نہ کرتے ہوئے ان کے ہمراہ چل پڑا۔ پوری کیلاش عوام اس وقت ایک گھلے سے میدان میں جمع تھی۔ بچے، بوڑھے، جوان سب اپنے اپنے ٹولے بنائے بیٹھے تھے۔ ایک طرف چند بزرگ خواتین برتن نما ساز بجا بجا کے کاٹتی آوازیں میں گیت گارہی تھیں اور الاؤ کے گرد میں میں مردوزن کی ٹولی دائرہ بنا کے گیس کر رہی تھی۔ کچھ کچھ دیر بعد ٹولی کے ارکان بدل جاتے تھے۔

میں دلچسپی سے ان سادہ چہروں پہ پھیلے مسرت کے عکس دیکھ بھی رہا تھا اور اپنے کمرے میں ان کے مختلف زاویے قید بھی کر چکا تھا۔ میری توجہ رقص سے زیادہ ان کے چہروں پہ تھی۔ آج اپنے چہرے میں کس کس اور کس دیکھے تھے۔ جودل میں وہی چہرے کے خدو خال سے ظاہر ہوتا تھا اور اس وقت ہر چہرے پہ صرف ایک ہی چہرہ جھملا رہا تھا اور وہ تھا خوشی کا..... محبت کا..... میری محبت کو ایک مترنم آواز نے توڑا۔

”صیب..... میں۔“ میں نے مڑ کے دائیں جانب دیکھا۔ میرے ساتھ بیٹھے ژان خان اور اس کے ساتھیوں کو ان کے کیلاش دوست رقص کے لیے لے جا چکے تھے اور اس وقت میرے دائیں طرف وہی عجیب سے نام والی لڑکی بیٹھی تھی جو میری مادری زبان بڑی روانی کے ساتھ بولتی تھی۔

”تم..... وہی ہوناں..... مریم علی۔“ میں نے ذہن پہ زور ڈالا۔

”نہیں، مومنہ علی..... مومنہ علی ہے میرا نام۔“ وہ ذرا سا مسکرائی تو قدھاری اتار مے رنگ والے اس کے گدازلیوں سے موتی جیسے چمکیلے خوب صورت دانتوں نے لشکارا مار کے جیسے روشنی سی میرے اطراف بھردی۔ الاؤ کی کٹی فٹ اوچی ہوتی آگ کی روشنی بھی مدھم سی پڑ گئی۔ میں مسکور ہو گیا، تب میں نے پہلی بار اس کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اس کی ہلکی بھوری زلفیں وہاں کی روایتی عورتوں کی طرح مینڈھیوں کی صورت سختی اور صفائی سے گندھی تھیں، ماتھے اور زرخار پہ بھرے تل گودے تھے۔ اس کی آنکھیں یہاں کے لوگوں جیسی سبز یا نیلی نہیں تھیں، بلکہ بھوری..... نہیں..... قرمزی یا شاید شہد..... ہاں شہد جیسا ہی رنگ تھا اور ان شہد کے قطروں کے گرد پھیلی وہ لالی جیسے شفق..... یہ نہیں کب تک میں خود کو بھلائے ان آنکھوں کا رنگ دریافت کرنے کی کوشش کرتا رہتا کہ وہ پھر سے گویا ہوئی۔

”میں تمہارا شکر یہ ادا کرنا چاہتی تھی صیب وہ تم ہی تھے جس نے کل میرے ابا کی قبر پہ فاتحہ پڑھی تھی۔ میں نے دور سے دیکھ کے بھی تمہیں پہچان لیا تھا۔ میرے دور کے آنے کے باوجود تم وہاں سے جا چکے تھے۔ برسوں سے سوائے میرے اس قبر پہ کسی اور نے فاتحہ نہیں پڑھی۔ اللہ تمہیں بڑا اجر دے گا، تم نے ایک اجنبی شخص کے لیے دعا کی۔“ وہ آبدیدہ ہو گئی تو میں بے چین ہوا تھا۔ نمکین پانی کی یہ یونندیں کہیں شہد میں نہ مل جائیں۔

”وہ تمہارے والد تھے۔ میرا مطلب ہے تم تو.....“ میں نے اس کے سیاہ لباس، سر پہ روایتی ٹوپی، اس پہ نگلی سپیاں اور موتیوں کو بغور دیکھا۔ وہ فوراً بولی۔

”الحمد للہ میں مسلمان ہوں اور ایک مسلمان باپ کی بیٹی ہوں۔ میرے ابا کا نام مومن علی تھا اور انہوں نے ہی مجھے مومنہ کا نام دیا، تاکہ میرے نام سے ہی یہ ظاہر ہو جائے کہ میں کون ہوں۔“

”اوہ.....!“ میں نے سر ہلایا، اب اسے کیا بتاتا کہ اس کا نام جاننے کے بعد بھی میں یہی سمجھتا رہا کہ کسی کم فہم نے بغیر مطلب جانے یونہی ایک خالص مسلم نام ایک کافر لڑکی کو دے رکھا ہے، بلکہ اس وقت تو مجھے اس انجانے شخص پہ غصہ بھی آیا تھا جس نے میری دانست میں یہ نام معقول حرکت کی ہوگی۔ لیکن اب یہ جان کر کہ وہ ایک مسلمان شخص کی مسلمان بیٹی ہے، مجھے طمانیت سی محسوس ہوئی اور وہ گھبراہٹ جو اسے اپنے قریب پا کے مجھ پہ طاری ہو گئی

تھی، بل میں زائل ہو گئی۔

میں پھر سے جشن کی طرف متوجہ ہو گیا، اسے شاید کچھ اور بھی کہنا تھا، جب ہی بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ بار بار مجھے دیکھتی لیکن میرے اس کی طرف دوبارہ پلٹ کے نہ دیکھنے پہ چپ رہ جاتی۔ آخر میں نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا۔

”تو تم رقص میں بھی اس لیے شریک نہیں ہو رہیں۔ لیکن یہاں ڈان خان، اس کے علاقے کے دوسرے بہت سے لوگ تو یہ جشن پورے جوش و خروش سے منا رہے ہیں اور تم تو پھر بھی یہاں کی رہنے والی ہو، انہی لوگوں میں سے ایک ہو، وہی لباس پہنتی ہو، وہی زبان بولتی ہو، پھر اس موقع پہ سب سے الگ تھلگ کیوں ہو؟“

”نہیں سوائے مذاہب کے میں نے کبھی خود کو ان لوگوں سے الگ محسوس نہیں کیا، نہ میں نے، نہ میرے ابا نے، اصل میں میری ماں کی لاش تھی۔ اس لحاظ سے یہاں موجود بہت سے لوگوں سے میرا خونی رشتہ بھی ہے۔ ایک غیر قوم، غیر مذہب کے شخص کی اولاد ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی مجھ سے غیریت نہیں برتی بلکہ پندرہ سال پہلے مرنے والی میری ماں کے حوالے سے آج بھی مجھے اپنا عزیز جانتے ہیں تو میں اپنی ماں کے حوالے سے انہیں اپنا کیوں نہ سمجھوں۔ ابا نے بھی تو یہی کہا تھا۔ میری ماں کے عشق نے انہیں ہر اس چیز سے عشق کرنے پہ مجبور کر دیا جو میری ماں سے متعلق تھا۔ یہاں کے لوگ، یہاں کی زبان، یہاں کے گیت، یہاں کے پہاڑ، ندی، نالے، یہاں کا چپہ چپہ انہیں عزیز تھا جہاں جہاں میری ماں نے قدم رکھا ہوگا۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”وہ بڑے احترام سے اس رقص میں شامل ہوتے تھے۔ مجھے اپنے ابا کا ماں کے ساتھ اس جشن میں آخری رقص آج تک یاد ہے۔ تب میں پانچ چھ برس کی تھی۔ یہی مقام تھا، یہی کیت فضاؤں میں گونج رہے تھے۔ اتنی ہی روشن آگ بھی ایسا ہی ستاروں بھرا آسمان تھا۔“ وہ کسی طلسم کے سے عالم میں الاؤ پہ نگاہیں جمائے ساکت بیٹھی تھی، صرف اس کے لب نامحسوس سی حرکت کر رہے تھے نہایت مدھم آواز میں کہے گئے اس کے الفاظ مجھے جکڑ رہے تھے۔

”میری ماں کا پورا وجود دمک رہا تھا، ابا کی نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹ نہ رہی تھیں۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے وہ دائرے میں رقص کر رہے تھے۔ میں یہاں اپنی نانی کی گود میں بیٹھی انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی، اچانک ابا کا ایک قدم ذرا آگے پڑ گیا۔ سنبھلتے

سنجھتے بھی اس کا ہاتھ ماں کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور..... اور ماں..... وہ بُت بنی کھڑی رہ گئی۔ سب لوگ حیرت کے عالم میں اسے دیکھنے لگے۔ کچھ شاید بات سمجھ گئے تھے اور کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک میری ماں نے.....

اس کے چہرے پہ آتے زلزلے کے آثار مجھے مکمل طور پر ارد گرد کے ماحول سے بے خبر کر کے اس کی یادوں کے ساتھ ساتھ بہنے پہ مجبور کر گئے۔ وہ مجھ سے تو کیا خود سے بھی بے خبر تھی۔

”وہ چیٹی..... چیٹی چلی گئی۔ میری نانی مجھے گود سے اتار کے روتی پٹتی اس کی طرف لپکی، میرا ابا بچا بچا اس کی حالت دیکھتا رہا، پھر سب لوگوں کے ساتھ اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن وہ چیٹی رہی، اپنے بال لپچتی، اپنا سینہ پٹتی رہی، پھر اس نے اپنا آپ بے سب سے چھڑایا اور بھاگ گئی۔ ابا پیچھے پیچھے بھاگا..... بھاگتا گیا۔ لیکن سب کے دیکھتے ہی رہ گئے اس نے نیچے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

پھر..... پھر سب نے بہت ڈھونڈا..... مگر اس کا کچھ پتا نہ چلا، اس کے لباس کی ایک دھجی تک کسی کے ہاتھ نہ لگی۔ اس رات دریا کو بھی جلال آیا ہوا تھا، اتنی تیز لہریں..... اتنی خوفناک موجیں..... نجانے کہاں بہا لے گئیں اسے.....“ آنسو اس کے گالوں پہ پھیلے تو وہ ہوش میں آ گئی۔ دونوں ہتھیلیوں سے آنسو پونچھ کر وہ..... چھٹکی چھٹکیاں روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں بھی دل پہ ایک انجان عورت کی اچانک اور عجیب سی موت کا ڈکھ لیے خاموش بیٹھا رہ گیا۔

”لیکن اسے ہوا کیا تھا؟ کیا پہلے بھی کبھی اسے یہ پاگل پن کے دورے پڑتے تھے؟“ میرے سوال پہ وہ افسردگی سے مسکرائی۔

”پاگل پن..... ہاں وہ پاگل ہی تو تھی۔ کسی بہت اپنے کے اچانک بچھڑ جانے کا خوف شاید یونہی پاگل کر دیتا ہے۔ دراصل میری ماں نے شادی سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا، وہ ایک اچھی مسلمان عورت بننے کی پوری دیانتداری سے کوشش کرتی رہی، لیکن اس کے خون کی تاثیر، مٹی کی محبت اسے اس سرزمین سے دور نہ جانے پہ مجبور کرتی رہی، اس نے شادی سے پہلے ہی شرط رکھی تھی ابا کے سامنے کہ وہ کبھی یہ وادی اور اپنے لوگ نہیں چھوڑے گی۔ اپنا پیدا انکی مذہب چھوڑ دینے کے باوجود وہ اتنی جلدی یہاں کے رسم و رواج اور عقیدوں کو فراموش نہیں کر سکی جو اس کی گھٹی میں پڑے تھے۔ اپنی ماں اور نانی کی طرح وہ بھی اپنا اور ابا کا

کھانے کا پیالہ الگ رکھتی تھی کہ مرد کا پیالہ جھوٹا کرنے والی عورت جلد بیوہ ہو جاتی ہے، یہ اس نے سُن رکھا تھا اور یہ بھی کہ تہوار کے رقص پہ ہاتھ چھوٹ جانا بہت بڑی بد شگونی ہوتی ہے اور جس کا ہاتھ اپنے سانگی سے چھوٹ جائے وہ اسی ماہ مر جاتا ہے۔ یہ خوف میری ماں کو لے ڈوبا۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ابا کو..... شاید اسی لیے اس نے خود کو دریا کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ تب سے میرے ابا نے رقص کرنا چھوڑ دیا۔ لیکن وہ اس جشن میں شریک ضرور ہوتا رہا۔

جن لوگوں نے کڑے وقت میں ان کا ڈکھ بانٹا، ان کی خوشیوں میں شریک نہ ہونا تو کم ظرفی ہوتی ہے اس لیے ابا کے بعد میں بھی اس جشن میں باقاعدگی سے شامل ہوتی ہوں، لیکن اس دائرے میں شامل ہونے کی ہمت نہیں ہوتی۔ وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے ٹھوڑی گود میں نکالے ہوتی رہی۔ لگ ہی نہ رہا تھا کہ کچھ منٹ پہلے ہم دونوں ایک دوسرے سے بالکل اجنبی تھے۔ بیکرنا واقعہ.....

”سنو تم کیا ہر اجنبی سے یونہی گل مل جاتی ہو۔“ بات تو نکل ہی چکی تھی منہ سے اب پچھتانے کے سوا کیا ہو سکتا تھا، لہذا اس میں بھی اس وقت اس کا خیال سے سرخ ہوتا چہرہ دیکھ کے خود کو اس قدر نامعقول سوال پہ کوس رہا تھا۔ وہ اب کچھ کڑی ہو گئی میں اسے روکنا چاہتا تھا لیکن وہ خود ہی ایک قدم آگے بڑھا کے پلٹ آئی۔

”اب ہم اجنبی تھے لیکن میرے باپ کی قبر پہ دو پھول چڑھا کے اور دعا پڑھ کے تم مجھے اپنے اپنے سے لگے تھے، میں تو صرف یہاں تمہارا شکر یہ ادا کرنے آئی تھی۔ مجھے تو خود یہاں ایک اور کیسے میں اتنی دیر بائیں کرتی رہی، مجھے معاف کرنا صیب اگر میری کوئی بات بری لگی ہو اور ہاں میں ہر اجنبی سے تو کیا کسی بھی اجنبی سے باتیں نہیں کرتی، اگر وہ اجنبی ہو تو.....“

وہ چلی گئی اور میں اس کے آخری الفاظ پہ غور کرتا رہ گیا، ماحول کی ساری رنگینی، رقص و سرور کی گہما گہمی اب افسردگی کی کہر میں لپٹ چکی تھی۔ اس کا بھیگا لہجہ میرے اعصاب بھگور رہا تھا، اس کی کپکپاتی آواز میرا دل لرز رہی تھی اور اس کی درد میں ڈوبی آنکھیں میری روح کے اندر تک شکاف ڈال کے مجھے یہ یاد کر رہی تھیں کہ کسی اجنبی کا ڈکھ، اپنا ڈکھ نہیں بن جاتا..... اگر وہ واقعی اجنبی ہو تو.....

آج صبح ہی فیروز کی واپسی ہوئی، میرے کچھ کہنے سے قبل ہی وہ معذرتیں پیش کرنے لگا۔ وجہ وہی تھی یعنی موسم کی خرابی۔

”تم نے جشن تو انجوائے کیا ہوگا؟“ اس کے سوال پہ میں چپ کر گیا۔ کیا کہتا، میں اپنی فیلنگز کسی کے ساتھ بھی شیئر کرنے میں بڑا کجس واقع ہوا ہوں یا یوں کہنا چاہیے قطعی نا بلند ہوں اس معاملے میں۔ سوائے تمہارے اے میری ڈائری، کوئی نہیں جس سے میں اپنے احساسات و جذبات بیان کر سکوں، لیکن کل رات کے بعد سے جو میں محسوس کر رہا ہوں وہ ابھی میرے قلم کی گرفت میں کیا آئے گا، اس جذبے کو ابھی تک میرا دل بھی صحیح طریقے سے پرکھ نہیں سکا۔ کبھی میں خود کو بے حد افسردہ محسوس کرتا ہوں، اداس، قنوطی، کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے خزانوں کے منہ کھل گئے ہوں، میرے لیے اور میں جھولی میں خوشیاں بھر بھر کے ٹھک رہا ہوں۔ کبھی کبھی مجھے اپنا آپ یکدم تنہا تنہا سا لگنے لگتا ہے۔ میرا چہرہ نا آشنا محسوس ہوتا ہے اور کبھی ایسا لگتا ہے جیسے اجنبی دیس میں کسی بہت اچھے نے بڑی گرم بخشش سے میرا ہاتھ تھام لیا ہو۔ پتہ نہیں یہ سب کیا ہے۔

میں آج سارا دن کمرے سے نہیں نکلا۔ میرے میزبان اسے رت جگے کی تھکن سمجھتے رہے، حالانکہ وہ کیا جانیں تھکن سے تو مجھے جیسے آوارہ گرد کا کبھی واسطہ ہی نہیں پڑا۔ فیروز سمجھ رہا ہے میں اس کی وجہ سے باہر نہیں نکل رہا اور ایک بات کہہ کر وہ اس نے مجھے چونکا ہی دیا۔

”یار از ریاب جاؤ لالہ کہیں گھوم پھر آؤ، پھر نہ کہنا فیروز نے اپنے گھٹنے سے لگا کے بٹھا دیا تھا۔ کون جانے دوبارہ تم یہاں کبھی آ پاؤ یا نہیں۔“

”دوبارہ..... ہاں مجھے واپس بھی تو جانا ہے.....“ میں نے اسے دیکھ کر ہنس دیا۔

”یہ الفاظ پہ..... آ کے واپس جانا تو ایک حقیقت ہے اس حقیقت کو کیسے فراموش کر بیٹھا اور اس کے لیے..... میری خاموشی محسوس کر کے وہ بولا۔

”یار تم تو بخارے چھڑے ہو، میں ٹھہرا زمیندار قسم کا بندہ اور وہ بھی ایک عدد پٹھانی کا شوہر..... اگر تم دو دن اور ٹھہرنا چاہتے ہو تو میں اپنا پروگرام آگے کر لیتا ہوں اور اگر زیادہ دن رکنے کا ارادہ ہے تو یار پھر مجھے فی الحال اجازت دو، چند انتہائی ضروری نوعیت کے کام وہاں رُکے پڑے ہیں۔ ہفتہ دو ہفتہ بعد پھر آ جاؤں گا۔ میرے لیے پہاڑوں کا یہ سفر کوئی نئی بات نہیں۔ تم کہاں آئے دن یہ تکلیفیں اٹھاتے پھرو گے۔ اچھی بات ہے کچھ دن اور رہ لو، اگر دل

وہ تو سو گیا، لیکن میرے لیے پھر سے کئی سوال چھوڑ گیا۔ میں الجھنے لگا کہ واپس جانے کی بات سن کر میرا دل رکا تو کیوں رکھا؟

ٹھہرنے کا سن کر میرے اندر اطمینان نے ڈیرے ڈالے تو کیوں؟

وہ کیا ہے جو ان وادیوں میں میں تلاشنا چاہتا ہوں؟ وہ کون ہے جس کی کشش مجھے اس زمین سے قدم آگے نہیں بڑھانے دیتی؟

میں نے آنکھیں موندیں تو شہد کے دو چشمے جھر جھر کرتے ہوئے بہنے لگے، میں نے آنکھیں کھول لیں۔

جواب مل چکا تھا۔

ایسا جواب جو اپنے قبلا میں بہت سے سوال لیے ہوئے تھا۔

۲۰ مئی ۱۹۸۰ء

دوباش تک میں اور ڈان فیروز کے ساتھ گئے۔ اس نے میرے بارے میں اسے اتنی تاکیدیں کیں کہ مجھے ہنسی آنے لگی۔ اسے دین میں سوار کرا کے میں نے ڈان خان کو بصد اصرار اس کے کام پہ بھیجا، ورنہ تو وہ فیروز کی تازہ ترین ہدایات کے زیر اثر مجھے ایک پل کو جدا کرنے پہ تیار نہ تھا۔ وہاں سے میرے قدم خود بخود اس طرف اٹھ گئے۔

میں دیر بعد میں نے خود کو محمد علی نامی شخص کی قبر پہ موجود پایا۔ نجانے کون شخص تھا یہ اور کتنی زور عشق تھا اس کا جس کے کھونے کے ڈرنے ایک عورت کے حواس پل بھر میں ختم ہو گئے، اسے ایک ساعت میں دیوانگی کی سرحد پہ لا کھڑا کیا اور وہ عورت..... کتنی کشش تھی اس کی محبت میں، جس نے ایک شخص کو اپنا خاندان، رشتے ناتے، ذات پات، سب بھلا کر اس حسین پرسماندہ ہی وادی میں کافر قوم کے ساتھ غربت میں زندگی گزارنے پہ مجبور کر دیا۔ میری محویت ٹوٹی، جب میرے عقب سے دو ہاتھ طلوع ہوئے اور قبر پہ گلاب کے پھولوں کی بارش برسا گئی۔ میں نے پلٹ کے دیکھا۔ حد درجہ سنجیدگی لیے وہ مومنہ تھی۔ میں ذرا سا مسکرایا، لیکن وہ مجھے دیکھے بغیر قبر کے قریب بیٹھ گئی اور زیر لب آیات کا ورد کرنے لگی۔ یقیناً اس کے گریز کا سبب میرا وہ دل آزار جملہ تھا۔ مجھے نئے سرے سے خود پہ غصہ آنے لگا۔ میں کاشن کی آرام دہ ٹراؤزر ذرا سا اوپر کھینچ کے اس کے نزدیک دوڑا نو بیٹھ گیا۔

اس نے پڑھنے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے اور بلند لرزیدہ دراز پلکوں کے ساتھ وہ مجھے اتنی مقدس، اتنی نورانی لگی کہ مجھے اپنا اس کے اس قدر نزدیک بیٹھنا گستاخی محسوس ہوا، میں ذرا سا کھسکا۔ چہرے پہ ہاتھ پھیر کے اس نے ایک نظر میرے پیچھے ہونے پر ڈالی اور کہے بغیر نہ رہ سکی۔

”اچھا ہوا صیب تم خود ہی پرے ہو گئے ورنہ پھر کہتے پھرتے، کیا میں ہر اجنبی کو اتنا ہی قریب بیٹھنے دیتی ہوں۔“

”لاحول ولا قوۃ“ اس کی جلی کئی بات پہ مجھے تاؤ آ گیا۔

”مومنہ مجھے گھما پھرا کے بات کرنا نہیں آتی، بلکہ یوں کہو آتی ہی نہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ اس وقت میری بات کا یہ مطلب نہیں وہ تھا دراصل تم اتنی اداس تھیں اور رو رہی تھیں، مجھے کسی لڑکی کو چپ کرانا نہیں آتا اور نہ ہی تسلی دینا۔ میں نے اس وقت صرف سوچا تھا کہ کوئی ایسی بات کروں جس کا تعلق اس بچے والے سے نہ ہوتا کہ تمہیں اداسی کی اس کیفیت سے نکال سکوں۔ ہاں میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ جلدی میں انتہائی فضول بات منہ سے نکل گئی۔ تمہیں برا لگنا ہی چاہیے تھا لیکن اگر میں معافی مانگوں تو کیا تم اپنا دل میری طرف سے صاف کر لو گی؟“

وہ کوئی جواب دیے بغیر قبر کی گرد سے سوکھے پتے اور ٹہنیاں اٹھانے لگی۔ مجھے لگا جیسے وہ کوئی جواب دیے بغیر لوٹ جائے گی لیکن جاتے جاتے وہ پھر سے ایک عجیب سی بات کہہ گئی۔

”مجھے صرف یہ برا لگا صیب کہ تم نے خود کو اجنبی کہا۔“ اس کا یہ سادہ سا جملہ مجھے بہن کر گیا اور پھر سے سوالوں کے جنگل میں بھٹکنے کو چھوڑ گیا۔ آج پھر طویل تاریک رات ہو گئی، چیتنے چنگھاڑتے سوال ہوں گے اور جواب میں میرے دل وہ دھڑکنے لگا۔

”آف..... میں کیوں رکا..... کیوں نہ آج ہی لوٹ گیا، لیروز کے ساتھ مجھے بیڑیاں پسند نہیں۔ الجھاتے سوالوں سے نفرت ہے مجھے..... ایک جگہ ٹھہرنے سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ پھر میں کیوں رکا..... کیوں..... آج رات مجھے اس کا جواب ڈھونڈنا ہے۔ ورنہ واپس لوٹ جانا ہے۔“

۲۱ مئی ۱۹۸۰ء

اور میں واپس نہیں لوٹا۔

مجھے لوٹنا بھی نہیں تھا۔ کم از کم اکیلے تو نہیں۔ اس طرح خالی ہاتھ تو نہیں، کبھی کبھی خود سے ہار مان لینا بھی کتنا اچھا لگتا ہے۔ رات بھی یہی ہوا تھا۔ اپنے ذہن و شعور کے تمام دلائل، جواز اور حیلے بہانوں کے پرچے اڑتے دیکھے تھے میں نے، صرف دل کی ایک ذرا سی ضد پہ..... جو ہمک ہمک کے بس یہی کہتا جا رہا ہے۔ صرف وہ..... بس وہ..... اور کوئی نہیں..... اور کچھ نہیں..... صرف وہ.....

۲۲ مئی ۱۹۸۰ء

کل کا سارا دن میں اُسے واوی کے مختلف حصوں میں تلاشتا رہا، لیکن وہ مجھے نہ ملی اور آج میں نے اسے جھیل سوک کے پاس پایا۔ وہ خوبانیاں ٹھنڈے پانی سے دھو دھو کے ٹوکری میں رکھتی جا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کے اس کا ذرا سا مسکراتا مجھے حوصلہ دلا گیا کہ اس دن ہونے والی کتنی کا اثر اس کے دل سے زائل ہو چکا تھا۔

”کہاں تھیں تم، مومنہ میں کل سارا دن تمہیں ڈھونڈتا ہی رہا۔“

میں لہجہ کی بے چینی چھپانے میں قطعی ناکام رہا تھا اور یوں بھی میں اب اس سے کچھ چھپاتا ہی کب چاہتا تھا۔

”کوئی کام تھا صیب؟“ وہ بدستور اپنے کام میں مشغول تھی۔

”مجھے بھلا کیا کام ہو سکتا ہے، تم سے اور یہ تم مجھے صاحب صاحب کیوں پکارتی ہو، غائب زریاب خٹک ہے میرا نام۔“

”اچھا نام ہے۔“ وہ منہ پہ زور زور سے چھپا کے مارنے کے بعد اس بڑے سے پتھر کے ایک سروے پہ ٹپ گئی، جس پہ میں ٹانگیں پیارے بیٹھا تھا۔ میں نے ایک نظر بھر کے اس کے مختلف چہرے پر دیکھے ہوئے پانی کے قطروں کو دیکھا۔

”تم نے بتایا کہ کل سارا دن کہاں غائب رہیں تم۔ پوری ہستی میں ہر جگہ کہیں بھی نظر نہیں آئیں۔“ اس نے میری بے تابی اور لہجہ کی تڑپ کو حیرت سے محسوس کیا۔

”میں..... میں.....“ بٹا لینی لگی تھی۔ میرے ماموں کی بیٹی ہے وہاں، اس کی خیر خبر کے لیے کل میں سارا دن وہاں رُکی تھی۔ آج میری خالہ وہاں گئی ہے اور میں ان دونوں کے لیے یہ پھل، انڈے اور پنکھی لے کے جا رہی ہوں۔“ اس نے ٹوکری کی طرف اشارہ کیا، جس میں اس کا ایک سیاہ جوڑا بھی رکھا تھا۔

”کیا تم اور کچھ دن وہاں روکو گی۔“ میرا دل تنگ پڑنے لگا۔

”نہیں تو..... بس یہ دے کے آ جاؤں گی۔“

”تو یہ کپڑے، میں سمجھا وہاں رہنے جا رہی ہوں۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ ٹوکرا کر یہ نکالے کھڑی ہو گئی۔

”میں بھی چلوں تمہارے ساتھ، یہ سامان اٹھالیتا ہوں۔“ میرے ہاتھ آگے

بڑھانے پر وہ گھبرائی۔

”نہیں، نہیں..... تم کیسے جاؤ گے، تم نہیں جاسکتے، وہاں یہ کوئی.....“

”بہت دور ہے کیا، یہ بٹالینی گاؤں“ اس نے بے ساختہ مسکراہٹ روکی۔

”بٹالینی۔“ گاؤں نہیں ہے وہ سامنے جو جھیل کے اس طرف گارے کا بڑا سا مکان

نظر آ رہا ہے ناں اسے بٹالینی کہتے ہیں اور اب خدا کے لیے مجھے جانے دو۔“

وہ زچ سی ہو گئی، اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ رہی تھی، پھر بھی میں

نے اس کی حالت پر مزید ستم نہ ڈھاتے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔

”اچھا جاؤ، لیکن میں کل اسی وقت اسی جگہ تمہارا انتظار کروں گا۔“ اور میں نے

بتانا کہ تمہارے ماموں کی بیٹی کو لڑکا ہوا یا لڑکی۔“

وہ جاتے جاتے چونک کے پلٹی اور میرے شرارت بھرے چہرے پر ایک خفگی بھری

نظر ڈال کے تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ اس کی حیا اور جھجک نے میرا دل موہ لیا۔ باپ کے

مسلمان خون کی تاثیر اس کی رگوں میں دوڑ رہی تھی جس نے اسے یہاں کی دیگر

دو شیرازوں کی طرح بے باک نہیں ہونے دیا اور ایک عام سی بات کہنے میں اس کا یہ

مذہب مجھے اتنا اچھا لگا کہ میں بٹالینی کے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود اس

کے سامنے انجان بنارہا۔

فیروز کے ساتھ پہلے دن کی سیاحت کے دوران میں اس جھیل پہنچی آیا تھا اور

کنارے کے بالکل سامنے موجود بغیر کسی کھڑکی اور روشن دان کے نیچی چھت والے اس

کچے مکان کو دیکھ کر میں نے ایران چاچا سے استفسار کیا تھا کہ یہ مکان آبادی سے اتنا الگ

تھلگ کیوں ہے۔

یہ ”بٹالینی“ ہے۔ ہمارے ہاں جب کسی عورت کو بچہ ہونے والا ہو تو وہ یہاں قیام

کرتی ہے، اپنے مرد اور اہل خانہ سے کٹ کر، ناپاکی والی عورت کو آبادی میں قدم رکھنے کی

اجازت نہیں۔ یہاں صرف اس کی دائی رہ سکتی ہے اس کے ساتھ، یا پھر گھر کی عورت ملنے آ

سکتی ہے۔ لیکن اسے بھی رات رکنے کی اجازت نہیں۔ بلکہ وہ اپنے ساتھ ایک صاف لباس

لااتی ہے جو بٹالینی کی حدود سے باہر رکھا جاتا ہے۔ زچہ سے ملنے کے بعد وہ جھیل کے پانی

سے غسل کر کے اپنا پہنا ہوا لباس دھوتی ہے، اور صاف لباس پہننے کے بعد بستی میں قدم

رکھتی ہے۔ مردوں کا اس عمارت کے قریب جانا منع ہے۔“

ایران چاچا کے تفصیل سے بیان کرنے پر فیروز نے ریہارکس دیا تھا۔

”تو عورتوں کا کیونٹی سینٹر ہے یہاں۔“

۲۳ مئی ۱۹۸۰ء

مجھے اس سے تقریباً دس بجے ملنا تھا، لیکن فجر کی اذان سے بھی کچھ پہلے مجھ پہ بے

پیشی چھا گئی اور ناشتے کے بعد تو مجھ سے ایک پل بھی نہڑکا گیا اور میں جھیل سہوک کی طرف

نکل پڑا۔ وہاں پہنچ کے میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اس سرمئی چکنے پتھر پہ

مومنہ کو بیٹھے دیکھا۔

”تم کب آئیں؟“

”بس ابھی.....“ وہ بھی شاید اپنی جلد بازی پر غل سی تھی۔

”پھر..... کیا خبر ہے؟“ میں نے اسے چھیڑا۔

”بیٹا ہوا ہے۔“ اس نے خوشی سے پورے لہجے میں بتایا۔

”چھ بیٹیوں کے بعد۔“

”سارک ہو۔“ میں اس کی پُر خلوص اور بے پایاں محبت سے متاثر سا ہو گیا جو اس

کے دل میں خود سے وابستہ ہر شخص کے لیے تھی۔

”اور پتہ ہے میں نے اس کا نام بھی رکھ دیا ہے۔“ ”زریاب خان۔“ اس نے جھجکتے

ہوئے بتایا۔ اس کی زبان سے پہلی بار اپنا نام سن کر میں سحر زدہ ہو گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس

نے میرا نام نہیں بلکہ میرے نام پہ پھول ہی پھول چن دیئے ہوں۔ میری خاموشی محسوس

کر کے وہ انک انک کے بولی۔

”کیا ہوا صیب..... برا لگا تمہیں..... تمہارا نام میں نے ایک..... میرا مطلب ہے

کہاں تم کہاں وہ..... شاید میں نے غلط کیا ناں۔“

”بالکل غلط کیا..... مجھے دوبارہ صاحب پکار کے تم نے بالکل غلط کیا۔ میں نے کل

ہی تمہیں منع کیا تھا کہ اب مجھے صاحب مت پکارنا۔ سخت برا لگتا ہے مجھے۔“

”اس میں بُرائی کی کیا بات ہے۔ یہ کوئی خراب لفظ ہے کیا..... میں تو تمہیں عزت دینے کے لیے صیب کہتی ہوں۔“

”مجھے تم سے احترام نہیں..... محبت چاہیے۔“ میری اس بات پر اس کا رد عمل وہی تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ وہ حسین بھی..... یہ تو میں جانتا تھا، مگر اس موقع پر چہرے پر سجانے کے لیے اتنے رنگ اس نے کہاں چھپا کے رکھے تھے اس کا اندازہ میں نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کچھ نہ بولی مگر اس کے نیم واکپکپاتے لبوں سے سانسوں کی مدھم آوازیں انوکھے اقرار کر رہی تھیں۔ شہد لٹاتی جھکی آنکھیں ایک ہی بار حیرانی سے مجھ پر اٹھی تھیں پر جھکنے سے پہلے خاموشی سے ایک عہد کر گئی تھیں۔

۲۴ مئی ۱۹۸۰ء

آج مومنہ کا ایک اور وصف کھلا مجھ پر۔ وہ اچھا لگتا لڑکی ہے یہ تو میں پہلی ملاقات میں ہی جان گیا تھا۔ آج میرے بار بار اس کے ہاتھ پر بھی لگتا ہے یہ میرا ہے۔

”میں نے سنا ہے یہاں کے لوگ خاصے شاعر اور عاشقانہ مزاج رکھتے ہیں۔ دو شیرازیں اپنے محبوب کے لیے گیت لکھتی ہیں اور رگاتی ہیں۔ تم پر تو ذرا اثر نہیں دکھتا ہے ان فضاؤں کی رنگینی کا۔“ میں نے جھوٹ موٹ منہ بھلایا۔

”اچھا میں تمہیں۔“ ”برہ“ سناٹی ہوں، مگر تم میری طرف دیکھنا مت، بالکل بھی نہیں ورنہ میں گانہیں پاؤں گی۔“ وہ بارمان کے بولی۔

”کیوں..... یہ کیسی پابندی ہے، میں کیوں نہ تمہیں دیکھوں..... ایسا ہی مشکل لگتا ہے، تمہیں میرے سامنے گیت گانا تو تم اپنی آنکھیں بند کر لو۔“

میں ایک پل کے لیے بھی اس ست رنگے چہرے کی طرف نہ دیکھی۔ میں نے چاہتا تھا۔ اس نے شہد کی جھیلوں پر گلابی پوٹوں کے پادل گرا دیے۔ ہلکے سروں اور سادہ لباس میں اجنبی الفاظ کا جادو میرے ارد گرد پھیلنے لگا۔ اس کے پوٹوں اور شفاف گردن پر بیک وقت ہلکی نیلی رگیں ابھر اور ڈوب رہی تھیں، رخساروں پر ہلکورے لیے بھنوروں میں، میں ایسا کھویا کہ وہ کب خاموش ہوئی یہ ہی نہ چلا۔

”کیسا لگا؟“ وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی میں کچھ بھی نہ کہہ سکا وہ مزید بتانے لگی۔

”برہ“ یہاں کا لوک گیت ہے، جس میں ایک لڑکی اپنے ایسے محبوب کے لیے جو انتظار ہے جو سفر میں ہے۔ وہ اس کی جدائی میں اپنی حالت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سفر

میں اٹھائی جانے والی اس کی صعوبتوں پر بھی فکر مند ہے۔

اسے میرے محبوب

میں ہر روز تمہارے لیے اپنے بالوں کے کنڈل بنا کے رکھتی ہوں۔

میری آنکھیں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں

تم نے چھ ماہ دکھ اٹھایا ہے

اسے میرے محبوب

لوٹ آؤ

میں تمہاری ٹانگوں کی جھکن، اپنے ہاتھوں میں سمولوں

اس نے بڑی خوب صورتی سے گیت کا ترجمہ پشتو میں دہرایا۔ تو مجھے ایک خیال آیا۔

”سنو، تم کچھ لکھنا پڑھنا جانتی ہو؟“

”تھوڑا بہت، جتنا پڑھا سکا۔ یہاں کتابیں عام نہیں ملتیں اس لیے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی، میرا ابا بھی کوئی عالم فاضل تو نہیں تھا، بس پڑھنا اور لکھنا سکھا دیا۔ نماز، کلمے بھی یاد کرادیے۔ ماں کے بعد ابا بہت بکھر گیا تھا۔ شادی کے پانچ چھ سال بعد تک بھی وادی کے اکثر لوگوں نے اسے دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ابا، ماں کا مذہب اختیار کر کے ہم لوگوں میں مل جائے لیکن اس کے برعکس ماں نے اس کے رنگ میں رنگنا سب سمجھا، یہ بات بہت سے لوگوں کو بھڑم نہ ہوئی انہوں نے اس پر اسی وادی میں رہنے کی مشورہ عائد کی اور ان کی توقع کے برعکس اس نے یہ بات مان لی۔ اس لیے وہ مجبوراً اسے ہر وقت لکھنے لگے۔“

ماں کے بعد ابا چاہتا تو مجھے لے کے یہاں سے جاسکتا تھا۔ اپنے شہر یا کہیں اور بھی، اس کے ماں باپ زندہ نہ تھے، مگر بہن بھائی ذات برادری سب تھا۔ وہ کہیں جا کے نئے سرے سے زندگی بسر کر سکتا تھا، لیکن وہ نہیں گیا، اس وادی کو چھوڑ کے نہیں گیا، جو اس کے عشق کی گواہ تھی جو اس کی محبت کی مہربان گود تھی۔

یہاں اپنی جگہ مضبوط کرنے کے لیے، ان لوگوں کو اپنانے کے لیے اس نے کیا نہیں کیا۔ یہ چند ایک ذرا پڑھے لکھے نوجوان نظر آ رہے ہیں۔ یہ ابا ہی کی بدولت ہیں۔ یہاں کے کاشت کاروں کو منڈی میں صحیح بھاؤ لگوانا بھی ابا نے سکھایا۔ بہت سی عورتیں اپنے شیر خوار بچے لیے اس کے پاس آتیں کہ وہ قصبے جا کر اسپرین، کھانسی کے شربت اور درد وغیرہ

کی گولیاں لا کے رکھتا تھا۔ زیادہ بیمار بچوں کو خود قصبے لے کر جاتا، علاج کے لیے۔ میری بوڑھی مانی کا سارا خرچہ اٹھایا، اس کی اپنی ماں جیسی خدمت کی۔ اپنی ان ہی عادتوں کی وجہ سے اس نے اپنی عزت اور مقام تو بنایا لیا، آج میں بھی صرف اس کے کرموں کا پھل ہی کھا رہی ہوں، یہاں کا بچہ مجھے تعظیم دیتا ہے، میرے رشتے دار مجھے کسی امانت کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ رہتی ہوں لیکن اپنے ابا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق وہ تمام عقیدے اور ارکان ادا کرتی ہوں، روزے رکھتی ہوں، نماز پڑھتی ہوں۔ کبھی کسی نے میرے کسی عمل پہ اعتراض کیا نہ روکنے کی کوشش کی۔

”تمہارے ابا کہاں کے رہنے والے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”لاہور نام بتاتے تھے اپنے شہر کا۔ سنا ہے بہت بڑا اور خوب صورت شہر ہے۔ تم نے دیکھا ہے۔“ وہ فرط اشتیاق سے بولی۔

”ہاں کئی بار، واقعی بڑا پر رونق شہر ہے۔ مجھے تو بچپن میں آتا کہ لاہور کا رہنے والا کوئی شخص اتنے برسوں تک کیسے اس شہر کو بھلائے رکھتا ہے۔“

”عشق..... صرف عشق.....“ وہ جذب کے لیے عالم میں کہنے لگی۔

”ابا جیسا عشق کوئی اور نہیں کر سکتا۔“ اس کی بات پہلے میں گنگناہی۔

ہم بھی اڑائیں خاک بیاہاں دشت سے گزر رہی تھیں

ہم بھی دکھائیں چاک گریباں لیکن جانتی دیکھو تو

”دیکھیں گے۔“ اس کے منہ سے پہلی بار شہر کے الفاظ سن کر میں بڑی طرح چونکا۔

”تم..... اردو بھی.....“ اس سے پہلے ہمارے مابین صرف پشتو اور پشٹو ہی گنگناہی کرتی تھی۔

”تم نے پہلے بتایا ہی نہیں کہ.....“

”تم بھی صاحب.....“ وہ کھلکھلائی۔

”ابھی میں نے بتایا تھا ناں کہ میں پڑھنا اور لکھنا جانتی ہوں تم تب ہی سمجھ جاتے۔“

”ہاں بس وہ.....“ میں جھل سا ہو گیا اس کے سامنے میں اتنا ہوش میں رہتا ہی کب

تھا کہ ہر بات کی باریکی میں جاسکوں۔

۲۸ مئی ۱۹۸۰ء

زندگی اتنی خوب صورت ہو جائے گی یہ کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ دن اتنے مہلکے لگیں گے، خبر ہی نہ تھی۔ پہروں اس کے ساتھ بچا کے بھی چھڑتے وقت اداسی دل پہ پنجے گاڑ لیتی ہے۔ گھنٹوں اس کے ساتھ ادھر ادھر کی ہزار باتیں کرنے کے بعد بھی واپس آ کے لگتا اس سے وہ سب تو کہا ہی نہیں جو پچھلی شب سوچ کے رکھا تھا اور تو اور برسوں بعد ایسا ہوا ہے کہ میں نے کئی راتیں ڈائری نہ لکھی۔ اپنا دل میں کھولتا ہی ڈائری کے ذریعے تھا اور اب جب دل کو اک نیا رفیق مل گیا ہے تو.....

وہ بولتی بھی تو اتنا اچھا ہے کہ گھنٹوں سنتے رہنے سے بھی تھکتا نہیں ہوں۔ وہ خود بھی جب تھک جائے تو چپ کر جاتی ہے اور تب میں اسے کچھ نہ کچھ کہہ کر چھیڑتا ہوں۔ غصہ بھی تو اٹھتا ہے اس قدر جلد آتا ہے تب وہ پھر سے بولنا شروع کر دیتی ہے۔ میرا دل کرتا ہے وہ بولتی رہے، میں سنتا رہوں چاہے وہ غصے میں ہی کیوں نہ کچھ کہہ رہی ہو۔ ابھی کل ہی وہ میری معلومات میں آئی کہ میرے لیے دادی کے مختلف رسم و رواج اور عقیدے بتا رہی تھی۔

”یہاں کے لوگ نہایت کمزور عقیدہ رکھتے ہیں۔ کچھ تو تدریس سے بے بہرہ رہنے کی بدولت بھی ہے۔ بہر حال جو بھی ہے اپنے عقائد پہ یہ سختی سے عمل کرتے ہیں۔“ اگر

یعنی حجہ کا دن مقدس ہوتا ہے اس دن کوئی کام نہیں کیا جاسکتا، البتہ تقریبات وغیرہ منعقد کرنے کے لیے یہ دن مناسبت ہوتا ہے۔ اسی طرح 20 کا ہندسہ اور مارچ، اپریل مئی کے مہینے مقدس کہلاتے ہیں۔ نیاز کو یہ لوگ جنت کا مبارک پھل سمجھتے ہیں۔ عورتوں کے لیے سیاہ رنگ مخصوص ہے۔ بال کٹوانا اور سرنگا رکھنا منع ہے۔ مرغ حرام ہے۔ اسی طرح اپنا پالا جانور خود کھانا بھی حرام ہے۔ عورت پر زور مویشی کا گوشت کھانا حرام ہے وغیرہ وغیرہ۔ آسمانی آفت اور نظام کے بارے میں ان کا اپنا نظریہ ہے جیسے بجلی چمکنے کا مطلب ہے کہ آسمان کی لڑائی کے دوران تلوار چلا رہی ہیں۔ اور جب گھوڑا اور گائے آسمان پہ دوڑ لگاتے ہیں تو آندھی آ جاتی ہے۔ پہاڑوں پہ پریاں رہتی ہیں، جن کی خدمت میں نذر چڑھانا ہر شخص پر فرض ہے جو کوتاہی کرے، پریاں اس کی زندگی پہ اچھا بُرا اثر ڈال سکتی ہیں۔“

وہ چپ ہوئی جیسے میری عدم دلچسپی کو محسوس کر لیا ہو۔ میں دلچسپی لے تو رہا تھا مگر اس کے ہاتھوں کی حرکت میں جو الفاظ کے ساتھ ساتھ جاری تھی۔ اسے دوبارہ بولنے پہ اکسانے کے لیے میں نے چھیڑا۔

”یہ تم بار بار۔“ وہ لوگ، وہ لوگ“ کیا کہہ رہی ہو۔ تم خود کون سی کم ہو۔ یاد نہیں اس دن بستی میں گھر دکھاتے ہوئے کیا ہوا تھا۔ ہر گھر کے داخلی دروازے پہ بکرے کے دو سینگ اور پتے لٹک رہے تھے۔ میں نے ہاتھ لگانا چاہا تو تم نے فوراً روک دیا۔ ”نہ نہ ہاتھ مت لگاتا۔ انہیں ہاتھ لگانے والا فوراً بیمار پڑ جاتا ہے۔“ حسب توقع اس کا منہ پھول گیا۔

”اس سے کیا ہوتا ہے، میں کوئی ان کے مذہبی عقیدوں پہ تو یقین نہیں رکھتی۔ نذر نہیں چڑھاتی، قربان گاہ نہیں جاتی، میرا ایمان بھی وہی ہے جو تمہارا ہے کہ بارش، آندھی، طوفان بھی زندگی اور موت کی طرح خدا کی طرف سے آتے ہیں اور ہر انسان کی زندگی میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔ آئندہ ایسی بات مت کرنا، مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ کسی کو کیا خبر میں کن کن حالات میں ایمان بچائے بیٹھی ہوں۔“ وہ زیادہ ہی گرم ہو گئی۔

”اوہو تم تو برا مان گئیں۔ میں نے ایسا کب کہا کہ تم خدا نخواستہ..... وہ تو اس دن تم نے ہی یہ بات کہی تھی جو میں نے یاد دلادی۔“

”تو کیا ہوا..... ان لوگوں میں پلنے بڑھنے کا کچھ اثر تو ہوتا ہی تھا۔ میری فطرت نہیں بدل سکتے یہ لوگ، عادتوں پہ تو اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ پتا ہے ہمارے ہاں چار پانی شام سے پہلے پہلے جہاں بچانی ہو وہاں بچالی جاتی تھی شام کے بعد کہیں اور منتقل نہیں کی جاتی۔ گھر کی باقی لوگوں کی طرح میں بھی اسی معمول پہ کھینچ رہی تھی۔ لیکن یہ اور اس سے دوسری بے ضرر سی باتیں یہ تھوڑا ظاہر کرتی ہیں کہ میں ان میں سے تھی۔ میرا پتا تو پکا مسلمان تھا۔ لیکن گھر سے نکلتے ہوئے اگر کالی بلی راستہ کاٹ جائے تو سب سے پہلے چھوڑ کر واپس آ جاتا تھا۔ میں نے ایک بار پوچھا بھی تو بے چارگی سے کہنے لگا۔

”پتہ نہیں، مگر ماں ہمیشہ کہتی تھی کالی بلی کا راستہ کاٹ دینا منحوس ہوتا ہے۔“ ”اچھا تمہارے ابا تم سے اپنے گھر کی، اپنے شہر کی باتیں کرتے تھے۔“ بمشکل میں موضوع تبدیل کر سکا تھا۔

”ہاں کبھی کبھی انہیں شہر سے زیادہ اپنا گاؤں یاد آتا تھا، جس میں انہوں نے اپنا بچپن گزارا۔ اپنے اسکول کی باتیں اور ایک گیت تھا اردو میں نہیں، کسی اور زبان میں شاید ان کی مادری زبان میں وہ اکثر گنگناتے تھے۔ مجھے بہت پسند تھا۔ کبھی میں نہ آنے کے

باوجود دل پہ اثر کرتا تھا۔ ماں کے بعد ابا کے اس گیت کے بولوں میں اور بھی درد آ گیا تھا۔“

”پنجابی میں ہوگا۔“ میں نے قیاس کیا۔ ”پتہ نہیں، بہت مشکل زبان تھی، اردو کے دو تین لفظ تھے اس میں عمراں کا لیا۔“ وہ ذہن پہ زور ڈال رہی تھی۔

”عمراں لٹگیاں پہاں پار“ میں بھانپ گیا۔ ”ہاں..... ہاں وہی۔۔۔“ وہ اچھلی۔

”پنجابی کا گیت ہے، بڑا مشہور۔ جہاں پنجابی بولی نہیں جاتی وہاں بھی پسند کیا جاتا ہے۔“ مجھے بھی اسے سننا بہت اچھا لگتا تھا، میری ایک پنجابی دوست نے اس کا لفظ لفظ ترجمہ جب مجھے بتایا مجھے اس گیت سے اور بھی محبت ہو گئی۔

”مجھے سناؤ ناں۔“ میں نے فرمائش پہ میں نے صاف انکار کر دیا۔ ”میں گاؤں کا نہیں۔“ مجھے کانا نہیں آتا البتہ تمہیں ویسے ہی اس کے بول سنا دیتا ہوں، مطلب کے ساتھ۔“ تب میں نے اسے کئی بول مطلب سمیت سنائے جو بات اسے زیادہ اچھی لگتی وہ دوبارہ فرمائش کر کے سنتی۔

عمراں لٹگیاں پہاں پار
ہالے وس او کا لیا
یعنی ہماری عمر بچوں کے لیے راستہ نکلتے گزر گئی۔ کچھ پل اور ٹھہر جا اے کالے بادل۔
ابھی نہ برس شاید وہ آتا ہی ہو۔

پھلاں دے رنگ کالے
سرخ گلاباں دے موسم وچ
پھلاں دے رنگ کالے
جدائی میں گزری بہار بھی ویران دکھتی ہے، اور سرخ گلابوں کے موسم میں پھولوں کے رنگ سیاہ نظر آتے ہیں۔

یہاں اس نے مجھے نوک کر دوبارہ اشعار اور مطلب سنے۔ ”مجھے کچھ صحیح طرح سمجھ نہیں آیا۔ جدائی کا کرب اپنی جگہ، لیکن پھولوں کا تو جو رنگ ہے سو وہی رہے گا۔ بھلا سرخ گلاب کالے کیسے نظر آنے لگتے ہیں۔“

”بھی میں تو لفظ بہ لفظ ترجمہ ہی دہرا سکتا ہوں، کوئی شاعر تو نہیں جو شعر کی روح میں اتر کر معنی چرالوں۔ اتنی شاعرانہ حس ضرور ہے کہ شاعر نے جو کیفیت بیان کی ہے اس کو دل کے اندر تک محسوس کر سکوں لیکن معاف کرنا میں اتنا بڑا زبان دان نہیں جو مکمل تشریح کے ساتھ تمہاری تسلی کر سکوں۔ ہاں اگلے بول سنو جو میں بڑے دل اور جذب کے ساتھ کہہ رہا ہوں شاید یہ بات سمجھ جاؤ۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ساری مٹھاس اپنے اندر سموئے ہوئے کہنا شروع کیا۔

غلام فرید میں تاں دوزخ سڑساں
جے میں ملے مانی دلوں موڑاں

”اگر کبھی میں نے تم سے ٹکھ موڑا، کبھی زندگی میں تھرا دل دکھایا، کبھی بے وفائی کا سوچا بھی تو خدا مجھے دوزخ میں پھینک دے، جسے ازل تک جھکے لے۔“

میں اپنا عہد پوری سچائی کے ساتھ دہرا رہا تھا، جب ان شہد سے بھری جھیلوں میں ہلکا سا تلاطم پیدا ہوا اور ایک گلابی تھیلی میرے لبوں پہ گھر گئی۔

☆☆☆

۳۱ مئی ۱۹۸۰ء

فیروز کی اچانک آمد پہ میں حیران رہ گیا۔ وہ دو ہفتے کا کہہ کر گیا تھا اور بمشکل ایک ہفتہ رہ کر واپس لوٹ آیا تھا۔ اس کا متفکر رویہ اور کھوجتے انداز بھی مجھے متوجہ کر گئے اور پھر اس نے خود ہی ذکر چھیڑ دیا۔

”لالہ میں کیا سن رہا ہوں، تم اور..... لڑکی؟“

”لڑکی؟“ میں چونکا۔ ”تمہارا مطلب ہے مومنہ۔“

”ہاں وہی۔ مجھے سوات تک اطلاع مل گئی تھی، مجھے یقین بھی نہیں آ رہا تھا کہ تمہارا نام کسی لڑکی اور وہ بھی کسی پہاڑی لڑکی کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ بہت کم عرصے میں کافی جان چکا ہوں تمہیں اور مجھے یقین ہے تم نے یونہی دن رات گزرنے کے لیے تو یہ کھیل شروع نہیں کیا ہوگا۔ یہ تمہاری فطرت میں ہی نہیں اور دوسری صورت میں..... یعنی اگر معاملہ سیریس ہے تو..... پھر“

”پھر.....؟“ اس پھر تک تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

”پھر یہ کہ آگے کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ میں نے ایران چاچا سے تمام معلومات لی ہیں اس کے بارے میں۔ اگرچہ وہ واوی کے مذہب سے تعلق نہیں رکھتی، لیکن تمام لوگ اس کی بے حد عزت و تکریم کرتے ہیں۔ اس کے والد کے ان لوگوں پہ کافی احسانات ہیں اور وہ احسان فراموش لوگ ہرگز نہیں، اس لیے کسی قیمتی امانت کی طرح اسے سنبھال کر رکھا ہے۔ اس کے باپ کی وصیت کے مطابق اس کے انھیال والے کسی مسلمان گھرانے میں ہی اس کی شادی کر سکتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بستی والے اور یہاں قصبے کے لوگ بھی کم ہی یقین کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہے، کافر قبیلے کے درمیان پرورش پانے کی وجہ سے اس پر کافر ہونے کا لیبل لگ چکا ہے۔ ایسے میں تمہارا سہارا دینا ان لوگوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہوگا۔ مشکل اگر کوئی پیش آئے گی تو وہ یقیناً تمہاری طرف سے ہوگی۔“

یہ نہیں تم اتنا بولنا سٹیپ لینے کی جرات کر پاتے ہو یا نہیں اور اگر کر بھی لیتے ہو تو یہ باتیں کہ تمہارا خاندان تمہارے اس فیصلے کو قبول کرنے میں کتنا وقت لیتا ہے۔ قبول کرتا بھی ہے یا نہیں؟ یہ بعد کی بات ہے پہلے تم فیصلہ کرو کہ تمہیں کیا کرنا ہے، تم کس حد تک انوالو ہو؟ اگر یہ محض وقتی جذبہ ہے اور تم خود میں اس کی خاطر سارے خاندان سے ٹکرانے کی ہمت نہیں پاتے تو میرا مخلصانہ مشورہ ہے اس تمام قصے کو یہیں دفن کرو اور میرے ساتھ واپس چلنے کی تیاری کرو۔ کیونکہ ایران چاچا کو ان کے قبیلے کے بڑوں نے میرے پاس بھیجا تھا اور اس کی ٹیم کے ساتھ کہ عزت کے ساتھ لڑکی رخصت کرانی ہے تو باقاعدہ اس کے ہاتھوں سے ہونا چاہیے، ورنہ ساری مہمان نوازی اور خوش اخلاقی ایک طرف۔

اس کی طویل تقریر کے اختتام پہ میں نے لمبی سانس کھینچ کے کب سے تنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے۔

”بہت بہت شکریہ.....“

”کس بات کا؟ خبردار کرنے کا۔“ وہ میرے رد عمل پہ حیران تھا۔

”نہیں میرے جذبات کو ایک واضح صورت دینے کا۔ میرے قدموں کو ایک صحیح سمت موڑنے کا، اور یہ جو کئی دن سے ایک بے نام سی الجھن تھی میرے دل میں کہ اب کیا

ہوگا..... کیا کروں گا میں..... کیسے واپس جا پاؤں گا..... کیسے رہ سکوں گا اس کے بغیر.....
اس الجھن کا حل میرے سامنے پیش کرنے کا، بہت بہت شکریہ میں کھل کر ہنسا۔
”باؤ اسٹوپڈ آئی ایم (کتنا احمق ہوں میں) اتنی سی بات تھی اور کبھی میرے ذہن
میں آئی ہی نہیں۔“

”واقعی.....؟“ فیروز تعجب سے بولا پھر قہقہہ مار کے ہنس پڑا۔
”کمال شے ہے تو بھی یار از ریاب۔“

”اب راہ بھائی دے ہی گئی ہے تو میرا خیال ہے دیر نہیں کرنا چاہیے۔ کیا کل ہی
چلیں بات کرنے؟“ میں بے چینی سے کھڑا ہو گیا، جیسے اگلے قدم پہ ہی تو ”کل“ ہے وہ
کچھ سنجیدہ ہو گیا۔

”میرا مشورہ ہے کہ تم پہلے اپنے بزرگوں سے بات کر لو۔ شاید انہیں کچھ اعتراضات
ہوں۔“

”شاید نہیں۔ یقیناً وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ کوئی فائدہ نہیں بات کرنے کا۔“
”پھر بھی..... بے شک تم اپنے فیصلے پہ قائم رہو..... اپنی مرضی سے ہر کام کرو.....
لیکن رسمی طور پہ ہی سہی، تمہیں ان سے بات تو کرنا چاہیے۔ یہ سب کچھ بات ہے نہ تم
ہمیشہ کے لیے خاندان سے کٹ کے رہ سکتے ہو نہ ہی یہی کوئی پوشیدہ دھوکہ دے سکتے ہو۔ اگر تم نے
ان سے چھپا کے شادی کر بھی لی تو۔“

”میں چھپا کے شادی کر رہا ہوں، نہ چھپا کے۔ یہی تو رکھوں گا۔ ہاں میں فی الحال
انہیں اطلاع دیے بغیر ان کی غیر موجودگی میں یہ شادی کر رہا ہوں گا۔ رسمی طور پہ بھی ان
سے اجازت طلب کرنے کا مطلب ہے انہیں الرٹ کروینا۔ جب ان کے انکار کے بعد
بھی میں نے اپنی مرضی سے ہی شادی کرنی ہے تو ابھی کیوں نہیں، کم از کم ابھی کیوں نہیں
اندازی کا اندیشہ تو نہیں، لیکن اگر باچا جان اور بڑے لالہ کو بھنک بھی پڑ گئی تو وہ ہر ممکن
کوشش کریں گے۔ مجھے اپنے فیصلے اور لہو دے سے باز رکھنے کی اور پھر بی بی جان۔ تم
جانتے ہی ہو یہ خونی رشتوں کی ایو فٹل بلیک میلنگ، میں بغیر کسی ذہنی دباؤ اور پریشانی کے
اپنی زندگی کا یہ سنہرا دور شروع کرنا چاہتا ہوں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ کیا تم میری
مدد کرو گے۔“

میں نے اچھی طرح اپنا نقطہ نظر اس پہ واضح کرنے کے بعد اس کا تعاون طلب کیا تھا

اور جواباً اس نے پوری گرم جوشی کے ساتھ مجھے وسیع بازوؤں میں بھینچ لیا تھا۔
یکم جون ۱۹۸۰ء

مومنہ کا طرز عمل میرے لیے ناقابل فہم ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا وہ میری بات سن کے
کھل جائے گی۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے خوف کے سائے ناپید ہو جائیں گے اور دل
میں اپنے بے یقین مستقبل کے حوالے سے بے سوالوں کو جواب مل جائے گا۔ لیکن میری
بات سن کے اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے اور واضح ہو گئے۔ وہ یوں بدک کے
اُچھلی جیسے میں نے اسے شادی کی پیش کش نہ کی ہو بلکہ آگ کے دریا میں کودنے کی
دعوت دی ہو۔ اس کے دونوں کانکار یہ میں بھڑک ہی تو گیا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیوں نہیں شادی کر سکتیں تم مجھ سے، میں یہ نہیں پوچھوں گا
کہ کیا تمہاری مرضی ہے مجھ میں۔ اس لیے کہ کوئی بھی شخص خامیوں سے مبرا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر تم ہر
کسی اور خامی سے مجھ سے محبت کر سکتی ہو، تو شادی کیوں نہیں.....“
”بس نہیں کر سکتی۔ ہاں بالکل نہیں کر سکتی۔“ اس کے مسلسل نفی میں سر ہلانے پر
غصے کے ساتھ ساتھ بے بسی نے بھی مجھے گھیر لیا۔

”میری مجبوری ہے کہ میں تمہاری محبت پر شک بھی نہیں کر سکتا۔ یہ بھی نہیں تصور
کر سکتا کہ مجھ سے محبت کا رامنہ کیا، مجھ سے جھوٹے اقرار کیے، نہیں..... نہیں کیونکہ
میں جانتا ہوں مومنہ ایسا نہیں کر سکتی، یہ چہرہ کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا، یہ آنکھیں کوئی
جھوٹ نہیں بول سکتیں۔“

اس لمحے شدت سے میرے دل میں خواہش ابھری کہ میں اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں
میں تھام کے اپنے اپنی آنکھوں میں جھانکنے پہ مجبور کروں، لیکن میں نے خود پہ قابو پایا اور
دونوں ہاتھوں کے روبرو بیٹھ کے عاجزی سے کہنے لگا۔

”مومنہ خدا کے لیے کچھ سوچو..... وہ کیا وجہ ہے، کون سی مجبوری ہے جو تمہیں اس
شادی سے انکار پہ اکسارتی ہے۔“ میرے بار بار کے اصرار پر وہ اپنے اندیشوں کو زبان
دینے پہ تیار ہو گئی۔

”تمہیں بہت آسان لگ رہا ہے ناں یوں سارے خاندان سے کٹ کر مجھے
اپنا لینا۔ سارے جہان سے ٹکر لے کر اپنی من مانی کرنا۔ ایک فرد کی محبت پانے کے لیے
دوسرے تمام رشتوں کو ٹھکرا دینا اتنا ہی سہل نہیں۔ یہ جو تم بار بار کہہ رہے ہو۔“ بعد میں

دیکھیں گے اور بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس کی کیا ضمانت ہے تمہارے پاس۔
ہو سکتا ہے تمہارے پاس کچھ بھی نہ بچے، نہ ماں، نہ باپ، نہ بہن بھائی، نہ خاندان، نہ
جائیداد۔“

”اور تم..... تم تو رہو گی ناں۔“

”فرض کرو میں بھی نہ رہی تو۔ ابانے بھی ماں کے بھروسے سب کو چھوڑا۔ لیکن ماں کو
تو زندگی نے بس چھ سال کی مہلت دی۔ اس کے بعد کیا رہا میرے ابا کے پاس۔ میری
صورت میں ایک مستقل ذمہ داری اور بس..... میں نہیں چاہتی کل کو پھر سے تم اور میں اسی
عذاب سے گزریں۔ اپنوں کی بے اعتنائی کا کرب نہیں۔ ماں کے پاس تو پھر بھی لگے۔
تمام رشتے موجود تھے۔ میرا دامن تو خالی ہے۔ میں خود ہی داماں، نہیں کہتا دے سکوں
گی۔“

”مجھے صرف تم چاہیے ہو مومنہ، صرف تم اور تمہارے لیے میں کوئی بھی نقصان اٹھانے
کو تیار ہوں۔ تمہارا ساتھ میری زندگی کے لیے اتنی بڑی آسائش ہے کہ اس کے بعد مجھے
کوئی خسارہ خسارہ نہیں لگے گا۔“

”اور میرے بارے میں کیا سوچا تم نے، میں نے خسارے میں رہوں گی۔ کل بھی
تہی داماں، آج بھی، اور آنے والے کل میں بھی میرے لیے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ تمہاری
اور میری محبت آج بھی اتنی ہی تناور ہے، کسی رشتے کے بغیر بھی، ہماری شادی نہ بھی ہوئی،
تم مجھے بھی نہ بھی ملے تب بھی میرے دل میں تمہارے لیے ہی مقام رہے گا۔ تم دنیا کے
کسی کو نے میں بھی چلے جاؤ میں تمہاری یادوں میں زندہ رہوں گی۔ اس بات کا یقین ہے
مجھے۔ پھر میں صرف محبت کے نام پہ تم سے شادی کیوں کروں۔“

اگر مجھے کسی سے شادی کرنا ہوگی تو وہ ایسا شخص ہوگا جو مجھے ایک ہی رشتے سے
متعارف نہیں کروائے گا، جو مجھے کسی کی بہو، کسی کی بھابھی بنائے گا، جو مجھے ایک بھرے
پرے کنبے میں بسائے گا، مجھے وہ دے گا جس کی مجھے سب سے زیادہ ضرورت ہے اور پھر
چاہے مجھے اس سے محبت ہو یا نہ ہو، وہ مجھے چاہے یا نہ چاہے۔ اگر شادی صرف ایک ہی بار
ہوتی ہے تو میں اسی سے کروں گی۔ ورنہ بے نام و نشان تو میں یہاں بھی ہوں، تمہارے
ساتھ جا کے بے سائبال نہیں ہونا چاہتی۔“

”تو پھر میں تم سے عہد کرتا ہوں کہ مومنہ علی، ایک خٹک مرد تم سے وعدہ کرتا ہے کہ تم

پوری آن بان اور وقار کے ساتھ اس کے گھر جاؤ گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا
پڑے۔“

”تم مجھے آن بان اور وقار کے ساتھ وہاں لے تو جاؤ گے لیکن سب کو مجبور تو نہیں
کر سکو گے کہ وہ میرے وقار کا احترام کریں۔ نہیں خان زبردستی تم مجھے ان کے سروں پہ
تھوپ کے اور بھی بے توقیر کر دو گے۔ میں سب سہہ سکتی ہوں اپنی بے عزتی اور تذلیل
نہیں۔“

اس کے لہجے میں سختی محسوس کر کے میں چپ کر گیا کہتا بھی کیا، میں ہر طرح کے بلند
جملے دعوے کر سکتا ہوں اور شاید ان پہ عمل بھی ممکن کیا میں واقعی باچا جان کی نظروں میں
اسے مجھ کی حیثیت دلا سکتا ہوں؟ کیا اپنے خاندان والوں کو مجبور کر سکتا ہوں کہ وہ اسے
خٹک فیملی کے باوجود ہر طرح محترم اور عزیز جانیں۔

ایک لمبی جنگ لڑنے کے بعد شاید میرے ماں باپ میری محبت کے ہاتھوں مجبور ہو
کر اس شادی کو تسلیم کر لیں، مومنہ کو خٹک ہاؤس میں قدم رکھنے کی اجازت بھی مل جائے،
لیکن وہ اتنے وسیع القلب نہیں ہو سکتے کہ ایک کم نسب و کم حیثیت سی لڑکی کو گھر کے
ساتھ ساتھ دل میں بھی جگہ دے دیں۔ مجھے چپ ہی رہنا تھا۔ میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کرنا
چاہتا تھا جسے پورا کرنا میرے اختیار میں نہ ہو۔

جون ۱۹۸۰ء

اس اذیت رات کی تمام تر سفاکی میرے چہرے پہ رقم تھی۔ رت جگے اور
تذیب کے خون آشام سائے آنکھوں سے ہویدا تھے، پلکیں جھپکنے میں بھی سینکڑوں
کھینچے چبھ جاتے تھے۔ میری حالت دیکھ کے فیروز بے چین ہو گیا اس کے ہر خلوص
استفسار پہ میں نے اپنا مسئلہ بیان کر دیا۔ وہی اپنے ارادے کی پختگی اور مومنہ کے انکار کے
پس منظر میں موجود تمام تر اندیشے۔

”فیروز، وہ ایک بار میرا ساتھ دینے پہ تیار ہو جائے تو ہر مرحلہ خود بخود آسان
ہو جائے گا۔ میں ایک دم سے اسے لے جا کے باچا جان کے سامنے نہیں کھڑا کر سکتا، نہ ہی
وہ اسے اس طرح قبول کر لیں گے۔ وہ کم از کم مجھے اتنی مہلت تو دے کہ میں اپنا نام اس
کے نام کے آگے لگا سکوں، مجھے اس کی ہمراہی کا اعتبار آ جائے تو میں تمام دنیا کا سامنا
کر لوں گا۔ بس ایک بار وہ میری مان لے۔“

میں بے بسی سے نڈھال تھا، اس کا اچانک اٹھ کے جانا بھی محسوس نہیں کر سکا۔ چند گھنٹوں بعد جب وہ واپس آیا تو خوشی سے چہرہ گنار تھا اور غلبت و بے تابی اس کی ہر حرکت سے عیاں تھی۔

”اٹھو خان خانان..... اٹھو جان جانان..... آؤ تمہیں بنا مکین سنواریں..... جلدی کرو، کام زیادہ اور وقت کم ہے۔ پہلے تو یہ لڑکا ہوا چہرہ اصل حالت میں واپس لاؤ، پھر انجینئر خاں سے حجامت وغیرہ بنواؤ، کچھ شکل پر رونق لاؤ۔ میرے یار کی بارات نکلتی ہے آج۔“ اس کی بے ربط گفتگو میری سمجھ سے باہر تھی۔

”کیا کہہ رہے ہو؟ کس کی بارات؟ کون سا یار؟“ وہ میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔

”میں گیا تھا مومنہ کے پاس، کچھ باتیں اس کی بھی سنی تھیں، اس کے اپنے اندر اپنے اپنی فکریں تھیں بڑی خود دار اور ناموس والی لڑکی ہے۔ ایک بختون زادے کو اور کیا چاہیے۔ ایسی شریک حیات جو آن بان اور شان میں اصلی ہو۔“ وہ نجانے اور کتنی دیر مومنہ کے قصیدے پڑھتا کہ میں نے ٹوک دیا۔

”تمہاری بات کیا ہوئی اس سے، مجھے یہ بتاؤ۔“

”قصہ مختصر یہ کہ وہ تم سے شادی پہ تیار ہے۔“ اس نے بالکل ہی حتمی بات کہہ دی

، جب کہ میں اس کی تفصیل جاننے پہ بے تاب۔

”اوہو مگر یہ ہوا کیسے، تم نے کیا کہا اس سے؟“

”اسے اعتماد دیا ہے، جس سے اس کی ذات نا آشنا تھی۔ اسے وہ رشتہ دیا ہے جس

کے سہارے وہ اپنے قدم مضبوطی سے جما سکتی ہے۔ یار عورت بڑی عجیب چیز ہے۔ محبت کے بارے میں بڑی حرص ہے اس کے اندر، چاہتی ہے کہ ہر شے اس کے پاس ہو۔ پھر جانے اور پھر مومنہ جیسی عورت جس سے قدرت نے ہر رشتہ پھین لیا تھا۔ اس کے اندر تو یہ طلب اور بھڑکی ہوئی تھی۔ میں اس سے تیرا یار بن کے ملنے گیا تھا لیکن اسے بہن بنا کے آ رہا ہوں۔

اور پھر وہ اپنی ذات اور تقدس کے حوالے سے بے حد حساس ہے بڑے بڑے خراب حالات اور نامساعد ماحول میں بھی اس نے خود کو سنبھال کے رکھا ہے۔ اپنی پاکیزگی، اپنے ایمان پہ غرور کی حد تک ناز ہے اسے۔ وہ نہیں چاہتی کہ کوئی بھی اسے یا اس کے کردار کو نشانہ بنائے۔ جب کہ تمہارے اپنی پسند کی شادی کر لینے کی صورت میں کم از کم

تمہارے گھر والوں سے تو اسے یہ طعنے سننے ہی پڑیں گے۔ اس کا حل بھی میں نے سوچ لیا ہے۔ تمہارا نکاح ابھی اسی وقت قصبے کی مسجد میں ہوگا۔ صبح ہم سب سید و شریف روانہ ہوں گے اور میری حویلی سے مومنہ رخصت ہوگی۔ تب جب تم اپنے والد یا بھائی کے ساتھ اسے لینے آؤ گے۔ یہ بات طے ہو چکی ہے اور اس سلسلے میں تم کوئی اعتراض نہیں کرو گے۔“

”لیکن تم نے یہ فیصلہ.....“

”صرف اور صرف اپنی بہن کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ اس کے کردار و مقام پہ کوئی حرف نہیں آئے گا اور اپنے یار کو اس کی تمام خوشیاں دلانے کے لیے مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ اچھا اب تفتیش کرنا بند کرو اور اٹھ کر ڈھنگ کے کوئی کپڑے پہن لو، اگر ہیں تو.....“ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کے اٹھایا۔

میں..... میری تو وہ حالت تھی کہ میں اس کا شکر یہ تک ادا نہیں کر سکا اور اچھا ہی ہوا۔ عیلا الفاظ اس کی محبت اور خلوص کا حق ادا کر سکتے تھے۔ میں خوشی سے گنگ تھا جب کہ مسرتیں اظہار کے لیے بے تاب، اسی لیے فوراً تم سے اے میری ڈائری، تم سے اپنی خوشی شیئر کرنے بیٹھ گیا۔ جب کہ آتے جاتے مختلف انتظامات میں مصروف فیروز کی پکار مجھے بار بار مٹا کر رہی ہے۔

جون ۱۹۸۰ء

اور لاخر مومنہ علی، مومنہ زریاب خٹک بن ہی گئی۔ چاہے کسی بھی طرح ہوئی مگر یہ شادی ہو تو تھی۔ مومنہ کی ضد کہ میرے گھر والے خود اسے رخصت کرانے آئیں اور میری مجبوری کہ لایا چاچا جان کسی صورت بھی کافرستان اپنے بیٹے کی دلہن ڈھونڈنے نہیں آ سکتے تھے اور کافرستان سے اسے کچھ کسی تعلق کے میں لے جانا نہیں سکتا تھا۔ یہ شادی یونہی ہوئی تھی۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں شہد کی دو جھیلوں کو بس پیاسا ہی تکتا رہوں۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کی منہاس سے میرے لب سیراب ہوں۔ یہ شادی یونہی کیوں ہوئی تھی؟ کیوں؟ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ خان ارباب خٹک کا سب سے لائق فائق اور لاڈلا بیٹا خان زریاب خٹک، سرحد کے مشہور خانوادے کا چشم و چراغ سینکڑوں میل پہ پھیلی اراضی اور کروڑوں کی جائیداد کا وارث، اپنی بارات میں چند پہاڑی لوگوں کی ٹوٹی لے کر مانگے کا شلو اور سوٹ پہن کر پیدل، کافرستان کی بستی میں تنگ گلی کے آخری کونے پہ موجود لکڑی اور پتھروں سے بنے اس دو منزلہ مکان تک چل کے جائے گا۔

دروازے پہ موجود چند بزرگ عورتوں نے میرا استقبال کیا اور میرے گلے میں خشک میوہ جات سے پرویا ہوا ایک ہار ڈال کر خیر مقدمی گیت گائے۔ گھر کے کچے احاطے میں کئی بچیاں تالیاں پیٹ پیٹ کے بے حال ہو رہی تھیں۔ نکاح مسجد میں ہو چکا تھا۔ مومنہ کے ماموں اور خالہ چونکہ مسجد تک نہیں آ سکتے تھے اس لیے ان کی خوشی کے لیے میں خود چل کے یہاں تک آیا تھا، تاکہ وہ اپنے رسوم و قواعد کے مطابق اسے رخصت کریں۔ لیکن مجھے اندازہ نہ تھا کہ یہ رسمیں اس قدر فضول اور بے زار کن ہوں گی۔ خصوصاً اس وقت تو میں جھلا گیا جب میرے ہی پاؤں کے موزے اتروا کے انہیں جلانے کے بعد مجھے دھونی دی گئی۔ میرے چہرے پہ ناگواری محسوس کر کے ایران چاچا نے بتایا۔

”بچہ یہ تمہاری نظر اتارتا ہے۔ جب وہ محبت کرنے والے ایک ہو جاتے ہیں تو ان لوگوں کی رومیں تڑپ جاتی ہیں۔ انہیں دنیا میں اپنی محبت محسوس نہیں ہوتی۔ ان کے حسد اور نظر بد سے بچانے کے لیے یہاں تمہیں دھونی دے رہی ہے۔“

اور کوئی یقین نہیں کرے گا، کہ میں..... جی ہاں میں حاسدوں کے خوف سے دبک کے بیٹھ گیا اور چپ چاپ نظر اتروانے لگا۔

کون کہتا ہے محبت دلیر ہوتی ہے۔ جی نہیں محبت تو بزدل ہوتی ہے۔ ذرا سے خطرے کو محسوس کر کے ہم جاتی ہے۔

☆☆☆

خان زریاب خشک۔
مومنہ علی۔

اور.....

فیروز وردگ۔

ایک سیدھی سادی کہانی کے آسان فہم سے کردار۔

پھر ابہام کہاں ہے؟ الجھاؤ کہاں ہے شروع ہوتا ہے؟

شاید تب جب باچا جان کو بابا کے اس جرات مندانہ اقدام کی خبر ملی ہوگی۔ یا تب جب بابا جان ماما کو لے کر یہاں آئے ہوں گے۔ لیکن تب، اس وقت فیروز وردگ کا کیا کردار رہے جاتا ہوگا اس ساری کہانی میں، کیوں ان کا نام اب بھی بابا جان کے حوالے سے اس قدر خوف و ہراس کے ساتھ لیا جا رہا ہے..... کیوں؟ آخر کیوں؟

مقدس پہ جان لینے کی بے تابی سوار تھی۔ لیکن ساتھ ساتھ ہی تحریر کا جو دو بھی اسے جکڑ رہا تھا، وہ اپنے ماں باپ کے ہمراہ ان تمام احساسات کو خود پہ گزرتا دیکھ رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک ایک سطر پڑھنے پہ مجبور تھی۔ ورنہ شاید دل تو اس کا ڈائری کے اختتامی صفحات میں اٹکا ہوا تھا۔

☆☆☆

ایک دھڑکتا ہوا سانسنا پھیلا ہوا تھا پورے کمرے میں صرف باچا جان کی اکھڑی اور دشوار سانسوں کی آمد و رفت کا شور تھا یا پھر بی بی جان کی دبی دبی سسکیوں کی مدھم آوازیں۔ ضیاء گریہ سے ان کی بلوریں آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ سفید پڑ جلال چہرے پہ زردی کھنڈی تھی اور دانتوں سے نکتے کے ساتھ جھنجھلے لب سسکیاں روکنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ خان افراسیاب خشک نے یکدم اٹھ کر کمرے میں ٹھلنا شروع کر دیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اب مزید خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ خان دراب خشک نے بھی ڈاکٹر کی تازہ ترین رپورٹ کو دسویں بار پڑھنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے بھائی کو دیکھنا شروع کر دیا کہ کب وہ اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ تیسری بار بی بی جان کے سامنے گزرتے ہوئے وہ اچانک پلٹنے اور والد محترم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

”آپ کی وجہ سے باچا جان..... صرف اور صرف آپ کی وجہ سے زریاب کا یہ حال ہوا ہے اور اس کے بے حال ہونے کی وجہ سے آج ہم سب کی حالت دگرگوں ہے۔ ہر چیز کے منہ پر آپ ہیں۔ آپ ہی ہیں اس کی ہر فضول حرکت اور بے کار مشاغل کو بڑھاوا دینے والے۔ اس کے لیے روایت کن اقدام سے چشم پوشی کرنے والے اور اس کی ہر ضد اور بات سنی کے آگے کمزور پڑنے والے۔“

خان اریاب خشک کے ناتواں اور جھریوں بھرے چہرے پہ موجود آنکھیں حیرت سے پوری طرح کھل گئیں۔ اپنی پوری زندگی میں انہوں نے بلاشبہ پہلی بار کسی کی اتنی اونچی آواز سنی تھی۔ پہلی بار کوئی ان کے سامنے ان کے جرم گنوار ہاتھ اور انگلی اٹھانے والا کوئی اور نہیں ان کا اپنا بیٹا، ان کا بڑا بیٹا خان افراسیاب خشک تھا۔

غم و غصے کی شدت سے ان کی رگیں ابھر آئیں اور سانس گویا چند لمحوں کے لیے ڈوب ہی گئی۔ بی بی جان تڑپ کے اٹھیں لیکن ان سے پہلے ہی دراب نے لپک کر آکسیجن کی پائپ سیٹ کر دی۔ وہ وہیں اپنے خان کے سرہانے کھڑی سیج کے دانے

گرا نے لگیں۔ دراب نے باچا جان کے ہاتھ سہلاتے ہوئے بڑے بھائی کو ملامتی نظروں سے گھورا۔

”بڑے لالہ، پلیز اپنے آپ پر کنٹرول کیجئے۔ باچا جان کی حالت ایسی ہر گز نہیں کہ وہ آپ کی تند و تیز باتیں سہہ سکیں۔“

”باپ بستر پہ ہے، لاغر ہے، مجبور ہے، بے بس ہے مگر۔۔۔“ بی بی جان نے بھی برستی آنکھوں سے بڑے فرزند کو دیکھا۔

”مت بھولو کہ وہ تمہارا باپ ہے۔ اپنے بڑوں سے اس طرح پیش آنا تو ہم نے تمہیں نہیں سکھایا افراسیاب۔“

”یہ بھی تو رونا ہے آپ نے جو کچھ سکھایا تھا بس مجھے زور سناگے اور درایت کو سکھایا سارے حدود و قیود کا احترام، بزرگوں اور ان کی مرضی کو ہر حال میں مقدم بنانا۔ خاندانی حرمت و ناموس کو بتایا ہر چیز پر اولیت دینا..... کاشش..... نیش..... زیباب کو بھی کچھ سکھایا ہوتا۔ لیکن اسے یہاں رہنے کا موقع ہی اب ملا وہ یہاں رہتا تو اسے اپنی روایات و خاندان سے انس بھی ہوتا۔ باچاجان کی طرف سے اسے کھلی چھوٹ مل گئی تھی، بخارہ بن گیا تھا وہ.... مگر ٹکر گھومنے والا..... اور بخاران ہی اُٹھا لیا گھر میں۔“

”لالہ کی طبیعت میں ہی ٹھہراؤ نہیں تھا۔ یہ جاگیر اور قواعد و پابندیاں سب ان کی فطرت سے بہت دور کی چیزیں تھیں۔ اس میں باچا جان یا بی بی جان کی تربیت کو مورد الزام ٹھہرانا غلط ہے۔“ دراب نے کہا۔

”اولاد کو لگام ڈالنا تو فرض ہے ماں باپ کا اور ایسی کی تیسری ایسی فطرت اور طبیعت کی جو اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی بھی زندگیاں داؤ پر لگا ہے۔“

”نہ اس کی سوچ بے لگام ہوتی، نہ وہ گھر سے بے زار ہو کر بھٹکتا پھرتا، نہ فیروز جیسے گمراہ کر دینے والے یاروں دوستوں کے چنگل میں پھنستا اور نہ وہ کافرستان کی پہاڑن اسے ملتی..... اور اگر یہ سب ہونا ہی تھا، ہو ہی چکا تھا تو کیا ضرورت تھی باچا جان کو اس طرح اس کے آگے ہار مان لینے کی، کیوں بھاگ گئے تھے اس کی پسند کو اپنانے کے لیے۔ کیوں اس کی ناخلفی اور نافرمانی کو نظر انداز کر کے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

ماں باپ کی اجازت کے بغیر انہیں بے خبر رکھ کے ایک حقیر اور بے مایہ لڑکی سے

انکاح کر لینا اتنا قابل معافی جرم نہیں تھا۔ انہیں چاہیے تھا اسے قید میں ڈلوادیتے۔ لڑکی کو مروا کے کالام ہی کے پہاڑوں میں پھنکوا دیتے۔ عشق کا چند روزہ بخار اُتر ہی جانا تھا ایک دن۔“

”بعض جادو سرچڑھ کے بولتے ہیں۔“ بی بی جان نے سرد آہ بھری۔

”اپنی ہی اولاد کو خود اذیت دینا آسان کام نہیں۔ اس لڑکی کو مروانا ناممکن نہیں تھا لیکن تم نہیں جانتے اس وقت زریاب کا جنون کس درجے کا تھا، اسے کھو دینے کے ڈر سے

خان جی اس لڑکی کا بال بھی بیکانہ کر سکے مگر یقین کرو انہوں نے ہر ممکن کوشش کی تھی اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی۔ لافعلی اختیار کرنے کی دھمکی بھی دی اور عاق کر دینے

کا ڈراوا ابھی لیکن سب بے سود۔ وہ پہلے ہی ہر چیز سے بے زاری ظاہر کرتے ہوئے چھوڑ دینے پہ تیار تھا۔ خان جی اس کی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو گئے تھے۔ تم ایک باپ ہو، باپ کی مجبوری جان سکتے ہو؟ انہوں نے شوہر کی طرف سے صفائی پیش کی۔

”میں صرف ایک باپ ہی نہیں۔ ایک بھائی بھی ہوں۔“ افراسیاب تھکے تھکے انداز میں کرسی پہ گر گئے۔ ان کے انداز سے بے چارگی ظاہر تھی اور آواز میں شکستگی۔

”اس کی جوانی برباد ہونے کا غم کیا مجھے نہیں ہوگا۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ پچھلے بیس سال اس گھر کے کسی بھی فرد نے پرسکون گزارے ہیں۔ کون ہے جو رات کو انگاروں پہ نہیں

لوقت ہوگا۔ یہ سوچ کر کہ خان زریاب خلک جیسا نفیس اور حسین شہزادہ.....“ دراب کی
انگھڑیوں میں پھیلی تھی ان کے قیاس کی تائید کر رہی تھی۔

میں صرف باپ ہی نہیں..... ایک بھائی بھی ہوں، ایک بیٹا بھی ہوں..... یہ بے

ہمارے پہلو میں کس کو تلاشتی ہیں کیا میں نہیں جانتا۔۔۔۔۔ اور اب۔۔۔۔۔ جب ان کی برسوں

کی امیدیں پوری ہونے والی ہیں تو یہ فیروز کا مسئلہ..... وردگ خاندان اس کی تاک لگائے بیٹھا ہے۔“ وہ انتہائی بے بسی کے عالم میں مٹھیاں کھول اور بھینچ رہے تھے۔

”اسی لیے رہ رہ کے مجھے بس یہ خیال آتا ہے کہ کاش اس وقت ہی اس مصیبت کا سد باب ہو گیا ہوتا۔ اس نے نکاح کر ہی لیا تھا تو کم از کم اس کی اس حرکت یہ خاموشی سے

تہتیا نہیں ڈال دینے چاہیے تھے۔ اس ذلیل عورت کو کھلی چھوٹ دے دی ہم لوگوں نے

زریاب کی زندگی سے کھیلنے کی۔“

”گزرے وقت کو کون سے کیا فائدہ لالہ۔ آپ بس اب کسی طرح کچھ ایسے انتظامات کریں کہ زریاب لالہ کو فوراً یورپ، یا انٹینٹس بھیجا جاسکے۔“
”ہوں..... کچھ ایسا ہی سوچ رہا ہوں میں بھی۔“

☆☆☆

وہ لے جاتا ہے سورج مجھ سے جینے کی سکت
رات بھر بن بن کے دن بھر ٹوٹا رہتا ہوں میں
وقت کی آندھی سے کھل کھل جاتی ہے میری گرہ
خود کو کس کس کے ہر وقت باندھتا رہتا ہوں میں
ہر دن پہلے سے کہیں بڑھ کے بزار کن اور ہر رات پہلے سے کہیں بڑھ کے طویل تر۔
ہر صبح کا سورج اپنے ہمراہ نیزے چھوٹی اذیتیں لٹاتا ہے اور ہر شام کی پھیلتی
تاریکی کے جلو میں ڈھیروں ڈھیروں یادوں کے تارے ہوتے ہیں۔
یادیں۔

جو اور بھی نڈھال کر دیتی ہیں

یادیں.....

جو اور بھی تنہا کر دیتی ہیں۔

کاش ایسا ہو کہ کسی روز سورج نکلے، مگر اسے میرے چھپتے چھپتے وجود کی پرچھائیں
بھی نہ ملیں سارا دن میرا تماشا دیکھنے والا شرمندگی سے اپنی ہی جدت کو آغوش میں منہ
چھپالے کاش ایسا ہو۔

کاش ایسا ہو کہ کسی روز شام ڈھلے مگر اس کی تاریکی کا ساتھ دینے کے لیے اسے میں
نہ ملوں۔ یادیں..... ان بوسیدہ دیواروں سے ٹکریں مارتی پھریں لیکن اس دل و دماغ تک
پہنچنے والے تمام رستے اندھے ہو چکے ہوں، جہاں ہر رات یہ یادیں دھاوا بولتی ہیں۔ کاش
کاش..... آہ.....

لمبی سرد آہ کھینچتے ہی اس کی سانس پھر سے اکھڑ گئی، اس نے پورا منہ کھول کے اس
مختصر سی چار دیواری میں موجود کثیف سی فضا سے زندگی کھینچنے کی کوشش کی، لیکن جیسے سانس
کے تمام رستے تنگ پڑ چکے تھے۔ سینہ دھونکی کی طرح چلنے لگا اور حلق سے عجیب آوازیں

نکلنے لگیں اس نے اپنا اوندھا سیدھا وجود بمشکل کھڑا کیا اور دیوار کے ٹھنڈے لمس کا سہارا
لے کر سیدھا بالکل سیدھا کھڑا ہو کے سر اُونچا کر کے سانس ہموار کرنے لگا۔

اپنے آپ سے ہم سخن رہنا
ہم نشیں، سانس اکھڑ جاتی ہے

☆☆

اور یہ آخری چند صفحات
مقدس نے چونک کے ضخیم ڈائری اور پھر وال کلاک کی جانب دیکھا۔
”آج سے پہلے میں کس قدر انجان تھی، کچھ بھی تو نہ جانتی تھی، کہاں ہیں میرے بابا
جان..... کون ہیں میری ماں..... کون ہیں وہ.....“
اور آج ایک ایک نقش جیسے میرے دل پہ نقش ہے اس حسین چہرے کا..... وہ چہرہ جو
میری ماں کا ہے۔

اور آج جیسے میں دل کے اندر تک اتر چکی ہوں..... اس کے دل کے اندر..... جو

میرے باپ کا ہے۔
کتنا اچھا لگتا ہے میرے باپ کی ان احساسات کو لفظ بہ لفظ پڑھنا، محسوس کرنا۔

ان تجربات کی گہرائی سے گزرتا۔ وہی امید و بیم کی کیفیات، وہی انتظار کی بے
تابیاں، وہی اظہار کی شدتیں، وہی کرب کے عالم..... ہر چیز میں نے خود محسوس کی
ہے۔ ہر چیز میں، میں خود شامل ہوں۔

وہ میرے دل کی جذبے، کسی احساس، کسی تجربے میں شامل نہیں۔ اس دکھ کا کچھ مداوا
تو نہیں ہے ناں۔

اور یہ آخری چند صفحات۔

نجانے یہ کون سی کہانی سنائیں۔ شاید انہیں میں وہ راز قید ہو، وہ بھید دفن ہو، شاید
یہی مجھے میرے ماں باپ کا سراغ دے جائیں۔“

اس نے ایک امید کے سہارے تھکی ہوئی آنکھوں کو پھر سے پڑھنے پہ آمادہ کیا۔
اگرچہ اس ڈائری کے مطالعہ کے دوران وہ کچھ اس طرح کھو گئی تھی کہ یہ بات ذہن سے
نکل ہی گئی کہ وہ اصل میں کیا جاننا چاہتی ہے، لیکن اب آخری دو تین صفحات نے اس کی
بے چینی پھر سے بڑھادی تھی۔ یہ ڈائری ہی وہ واحد ذریعہ تھی جس سے وہ اتنا کچھ جان پائی

میرادل کرتا میں زرسا نگہ باجی کے پاس بیٹھ کے انہیں وہ تمام واقعات سناؤں جو مجھے اپنے پچھلے سفر میں پیش آئے تھے اپنی آنکھوں سے انہیں دنیا کی سیر کراؤں لیکن ان کے پاس اپنی سہیلیوں اور کزنز کے جہیزوں اور رشتوں کے حاسدانہ تذکروں کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ اور بڑے لالہ..... ان سے میں محبت کرتا ہوں لیکن احترام کے ساتھ..... وہی احترام جو مجھے باجی جان سے قریب نہیں ہونے دیتا وہی احترام میرے اور لالہ کے درمیان بھی حائل ہے۔ اسی لیے میں نے سوچ رکھا ہے کہ میں اپنے اور اپنی اولاد کے درمیان ایسا کوئی رعب و دبدبہ نہیں رکھوں گا کہ کھل کے محبت کا اظہار بھی نہ کر پائیں گے ہم ایک دوسرے سے، پھر آخردراب کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ وہ مجھ سے چھوٹا بھی ہے، ہارورڈ میں پڑھتا ہے۔ پھر کیوں نہیں ہمارے مزاج ملتے۔ کبھی کبھی تعلیم بھی انسان کا کچھ نہیں دے سکتی۔ ہارورڈ سے آنے کے بعد وہ یہاں مرغوں اور بازوؤں کی لڑائیوں کے کھیل کھیل رہا ہے، جنگلی سوروں کا شکار کرتا ہے، باجی جان کی شوقیہ دشمن داریوں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتا ہے اور پھر چٹھیاں ختم ہوتے ہی تعلیم میں مگن ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھ سے لگتا ہے ہم تینوں بھائیوں میں سے وہی اصل خاندان ہے کہ باجی جان کے بقول اس کے تئیں ہی اصل نسل خانوں والے ہیں۔ اگر ہر وقت بندوق اٹھائے رکھنا، سنگلاخ پہاڑوں پہ خاک اڑائے پھرنا اور پرہیز جنگلوں میں واہیات قسم کے جانور شکار کرتے پھرنا ہی خان ہونے کی شان ہے تو میں باز آیا ایسی سرداری سے۔ مجھے تو شوروں سے رنگ، خوشبو اور نصیبا اثریٹ کرتی رہی۔ جہاں جہاں رنگ نظر آئے میں چرانے گیا۔ جہاں سے خوشبو آئی میں اس کے تعاقب میں بھاگا اور ایسے میں صرف یہ ڈائری ہی تو تھی جو میرے ہر تجربے میں شریک تھی۔

پھر مومنہ آئی..... اور میں جو سوچے بیٹھا تھا کہ خاندان کی کسی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا چاہے زندگی بھر کنوارہ ہی کیوں نہ رہنا پڑے، کیونکہ کسی میٹرک پاس سے میری ذہنی مطابقت ہرگز نہیں ہو سکتی تھی اور لڑکی بھی وہ جو پشاور سے آگے صرف چار سہ اور نو شہرہ تک گئی ہو۔ وہ میرے پر لگے وجود کا ساتھ کہاں تک دے پائے گی..... لیکن مومنہ..... اس نے میرے سارے تجربات غلط ثابت کر دیے۔ میں جان گیا کہ ذہنی مطابقت کے لیے تعلیمی سطح کا یکساں ہونا ضروری نہیں اور وہ لڑکی جو میٹرک تو کیا پانچ جماعتیں بھی نہ پڑھی ہوئی تھی..... جو اس بیضوی وادی کے چاروں طرف کھڑے پہاڑوں سے باہر کی دنیا

تھی اور یہی ڈائری وہ واحد ذریعہ ہے جو اس کو اپنے باپ کا سراغ بھی دے سکتی تھی۔ وہ یہ تو جان ہی چکی تھی کہ شادی کے بعد باجی جان کو کتنا وقت لگا باجی جان کو رضا مند کرنے میں اور کیا کیا دھمکیاں دے کر انہوں نے بی بی جان کو مجبور کیا تا یا جان کی ناراضگی کا ذکر بھی تھا اور پھوٹ بھی جان کی برہمی کا بھی۔ ماما کے اندیشے بھی بیان کیے گئے تھے اور ان تمام واقعات کا بھی سرسری سا ذکر تھا جو شادی کے بعد حویلی میں پہلی بار آنے پر پیش آئے تھے۔

باجی جان نے ناپسندیدہ بہو کو تسلیم کرنے کے لیے باجی جان کی آوارگی خرید لی تھی۔ ان کے سیر و سیاحت کی شوق پہ پابندی لگا کر کاروبار میں شریک ہونے کی شرط رکھی تھی۔ یہ بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اپنی پسند کو زبردستی تسلیم کروانے کے باوجود باجی جان انہیں گھر کے افراد کے دل میں جگہ دینے سے قاصر رہے تھے لیکن ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ خوشگوار شب و روز کا تذکرہ یہ بھی ظاہر کرتا تھا کہ اہل خانہ کے کھنچے کھنچے روئے اور ناراضگی کے باوجود دونوں مطمئن اور شاد تھے اگرچہ اب ڈائری میں خاصی بے قاعدگی آ گئی تھی، کہیں چار روز تو کہیں دو ہفتے کے وقفے سے لکھی گئی تھی لیکن کہیں سے بھی دونوں کے مابین ہلکی سی چپقلش اور ناچاقی کا ذکر نہیں ملتا تھا۔ وہ حیران تھی کہ اتنی انڈر اسٹینڈنگ کے بعد آخروہ کیا بات تھی جس نے یکا یک دونوں کے راستے الگ کر دیے۔ اس نے ڈائری پر غور جمایا۔

18 اکتوبر 1981

مجھے یقین نہیں آتا کہ میں اور بے ڈرہ سال بعد ڈائری لکھ رہا ہوں۔ مومنہ کے ساتھ میرے اندر ایسی تباہیوں کو یکسر کمر ڈالا ہے اور اب مجھے اپنے احساسات و جذبات بیان کرنے کے لیے کانغہ کے بے جان لکڑوں کی ضرورت نہیں رہی۔ میں نے خود کو ہمیشہ اس خاندان میں مس فٹ محسوس کیا۔

اپنے تمام لوگوں سے محبت کرنے کے باوجود بھی ذہنی طور پر میں خود کو ان سے بہت فاصلے پہ پاتا تھا۔ چلو بی بی جان، زرسا نگہ باجی وغیرہ سے ذہنی مطابقت نہ ہونے کی ایک وجہ تعلیم بھی ہو سکتی تھی، وہ گھر کی دیواروں میں قید رہنے والی خواتین تھیں اور ظاہر ہے کہ ان کی ذہنی سطح بھی اس درجہ کی ہی تھی۔ ان کے ساتھ بیٹھ کے میں ہمیشہ ہی خاندانی جھگڑوں کی تفصیل اور رشتوں کے تانے بانے سن سن کے بورتا ہوتا تھا۔

کو بالکل بھی نہیں جانتی تھی۔ وہ لڑکی میری سب سے قریبی ہستی بن گئی۔ میں اسے اپنی روح کے اندر محسوس کرنے لگا۔ اسے اپنے ذہن میں روشن دیکھنے لگا اور دل کے اندر دھڑکتا سننے لگا۔ پھر..... پھر..... پھر کیسے میں اسے کھودیتا۔ مجھے اسے پانا ہی تھا چاہے اس کے لیے مجھے سب کچھ کھونا پڑتا یہ میں نے خود سے وعدہ کیا تھا۔ لیکن شکر ہے کہ مجھے کچھ کھونا نہیں پڑا۔

اسے اس حویلی میں لانے کے لیے کچھ مشکلات تو پیش آئیں لیکن بہت جلد سب کچھ صحیح ہو گیا۔ اگر میں نے کچھ کھویا تو محض اپنی آزادی۔ باچا جان نے میری خواہش کے بدلے میری آزادی طلب کی تھی اور تب میں نے سوچا تھا کہ میں بہت بڑی قیمت چکا رہا ہوں۔ اب سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے، کاش باچا جان آپ نے کچھ اور مانگ لیا ہوتا۔ یہ صحرا نوردی تو یوں بھی ختم ہوتا ہی تھی۔ مہینوں بعد جب بھی گھر لوٹتا تھا تو باچا جان کے سینے سے لگ کے ٹھنڈک سی اتر جاتی تھی وجود میں، بی بی جان کے ماتھے سے ہلکے ہلکے سے پرسکون کر دیتے تھے لیکن کچھ ایسا نہ تھا جو مجھے رکنے پہ مجبور کرتا۔ چند ہی دنوں بعد میں پھر سے نئے سفر پہ جانے کے لیے کمر کس لیتا۔ اب احساس ہوتا ہے کہ پاؤں میں بیڑیاں کیسے ڈلتی ہیں۔

میرا سب کچھ تو یہاں ہے اس حویلی میں پھر سمنہ پار کیا کھینچنے جاؤں گا۔ شاید وہی تھی جس کی تلاش نے مجھے دنیا کھنگالنے پہ اکسایا اور ہاں اک اور تھنہ، مقدس اس کے آنے کے بعد تو اب کاروبار میں بھی دل نہیں لگتا، پہلے ہی خاصی مشکل سے دل و دماغ دونوں کو اس جانب راغب کیا تھا لیکن اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کی گرفت سے اپنی انگلی چھڑا کے گھر سے نکلنا کس قدر دشوار لگتا ہے۔ پھر بھی..... کان تو پڑا گا۔ یہ بات میں نے بہت ہی بری طرح مشغول ہو جانے کے باعث لالہ کار، تھان کاروبار کی طرف کم ہی ہو گیا تھا اور میرے دلچسپی لینے کے بعد تو ان کا عمل دخل بس برائے نام ہی رہ گیا ہے۔ باچا جان کا بلڈ پریشر بھی بہت ہائی رہنے لگا ہے، جاپان جانا بھی ضروری ہے ورنہ ایک بڑی ڈیل ہونے سے رہ جائے گی۔ مومنہ کو شادی کے بعد پہلی بار تنہا چھوڑ کے جا رہا ہوں میری سوچ کے برعکس وہ خاصی پر ہمت نظر آ رہی ہے اور مسلسل مجھے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس دلا رہی ہے کل ہی میری فلائیٹ ہے اسلام آباد کی وہاں سے میں تقریباً بیس روز کے لیے جاپان روانہ ہو جاؤں گا۔“

ڈائری ختم ہو چکی تھی اور مقدس بری طرح الجھ گئی۔ ڈائری اٹھانے سے قبل اس نے اچھی طرح یہ تسلی کرائی تھی کہ یہ وہاں موجود ڈائریوں میں سے آخری لکھی گئی ڈائری تھی۔ ”تو کیا ان کے جاپان جانے کے بعد کچھ ہوا تھا۔ کیا واقعی وہ سب ہوا تھا جو بی بی جان اور چچی جان کہتی ہیں کہ ممانے بابا کی عدم موجودگی میں کسی اور سے..... نہیں نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ ڈائری پڑھنے سے قبل میں نے بھی یہ فرض کر رکھا تھا کہ واقعی میری ممانہ غیر ملکی اور غیر مسلم ہونے کی وجہ سے آزاد روش رکھتی ہوں گی۔ حویلی کی رسموں کو انہوں نے قبول نہیں کیا ہوگا اور اپنے لیے کوئی دوسرا راستہ چن لیا ہوگا اور اسی بات پہ دل برداشتہ ہو کر بابا جان یہ ملک چھوڑ کے چلے گئے ہوں گے۔ لیکن..... یہ ڈائری تو کوئی اور کہانی سناتی ہے۔“

میری ممانہ تو غیر مسلم ہیں اور نہ ہی غیر ملکی..... نہ یہودی نہ عیسائی، نہ ہی جرمن نہ فرینچ ان کا ”مومنہ“ ہونا ہی تو بابا جان کو چونکا گیا تھا اور انہوں نے ہر ہر صفحے پر ان کی پاکیزگی کا عقیدت بھرے انداز میں ذکر کیا ہے۔ اب تو میں میرے بھی یہ تصور نہیں کر سکتی کہ وہ کبھی بابا کو دھوکا بھی دے سکتی ہیں۔..... پھر..... پھر کیا وجہ تھی..... کیا ہوا تھا ان کی غیر موجودگی میں..... کیوں نہیں وہ واپس لوٹے.....؟

یہ وہ سوال تھے جواب بھی باقی تھے اور ایک سوال یہ بھی۔ کیا میری یاد نے بھی انہیں واپس لوٹنے پہ مجبور نہیں کیا؟“ اسے ان آخری صفحات سے دیکھتے ہوئے تھی وہ تحریر یاد آنے لگی جو اس کے بابا جان نے اس کی پیدائش کے وقت لکھی تھی۔ اس نے ایک بار پھر صفحے پلٹے۔

نمبر ۱۹۸۱ء

میں اتنا مطمئن تھا مومنہ کے ساتھ کہ مجھے کوئی کمی کبھی محسوس ہی نہ ہوتی تھی اور اب ایک ننھی سی پری نے آ کے یہ احساس دلایا ہے کہ زندگی تو ابھی ادھوری تھی۔ ابھی اک رنگ باقی تھا..... اور میں نہیں جانتا تھا کہ یہ رنگ اتنا شوخ ہوگا۔ زندگی سے اتنا بھرپور..... جب اس نے پہلی بار اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کے مجھے دیکھا..... پہلی بار میرے ہاتھوں نے اس کا تحمل سنا تھا چہرہ چھو، پہلی بار جب وہ منے منے گلابی ہونٹ بسور کر روئی۔ اور پہلی بار جب میں نے اسے سینے سے لگایا۔ میری گود میں آتے ہی وہ چپ کر گئی، جیسے روئی ہی صرف میری گود میں آنے کے لیے تھی۔

”دیکھو مومنہ، دیکھو اس کا چہرہ..... بالکل تمہارے جیسے ہونٹ، وہی ناک، وہی رخسار، وہی پیشانی، وہی آنکھیں۔“

”نہیں، اس کی آنکھوں کا رنگ میرا نہیں ہے۔“

اس کے کہنے پہ میں نے ذرا سا گدگدائے اسے دوبارہ آنکھیں کھولنے پہ مجبور کیا۔
”ارے ہاں واقعی۔“ اس کی نیلی کانچ سی آنکھیں دیکھ کے میں نے کہا۔ وہ شاید اس طرح کسمسائے جانے پہ بردا مان گئی تھی۔ پھر سے مٹھیاں بچھنے کے رونے لگی۔

”دیکھو، مومنہ! تمہاری طرح اس کے بھی رونے پر آنسو نہیں نکلتے، صرف آنکھوں کا رنگ یہ بتاتا ہے کہ وہ رورہی ہے۔ تم بھی جب روتی ہو تو شہد کے قطروں کے گرد جیسے کوئی روح افزا گرا جاتا ہے۔“ میری مثال پہ وہ کھلکھلا کے ہنسی۔

”اور یہ جب روتی ہے تو نیلم کے ٹکڑوں کے گرد کوئی ہیرو کوٹ کے پھینک دیتا ہے۔“ اس کی نیلی آنکھیں دیکھ کے میں نے کہا تھا۔
مقدس نے اپنی پلکوں کو انگلی کی پور سے چھوا وہ نم نہیں۔

”بابا جان دیکھیے آج بھی میرے آنسو آنکھوں میں ہی ترپتے پھرتے ہیں۔“

☆☆☆

وہ دیوار سے سرٹیکے اکڑوں بیٹھا تھا جب ہڑبلا کے دھکے اس نے چوک کے چاروں طرف دیکھا اور پھر سے رات کے سنانے میں اس آواز کو کھوجنے کی کوشش کی مگر بے سود..... وہ بے چین ہو کے ٹہلنے لگا۔

”کیا میں نے خواب دیکھا تھا؟ لیکن خواب دیکھنے کے لیے سونا بھی تو پڑتا ہے۔ میں کب سویا ہوں جو خواب دیکھا ہو..... پھر وہ آواز.....“
یادوں کی جڑیں پھوٹ ہی پڑتی ہیں کہیں

دل اگر سوکھ بھی جائے تو بکھر نہیں ہوتا

”یہ کس دراز سے اس کی یاد پھوٹ پڑی۔ میں نے تو دل کب کا پتھر کر لیا تھا۔“ وہ سینے مسلنے لگا جہاں دو نیلی کانچ سی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔

”اور جب یہ روتی ہے تو نیلم کے ٹکڑوں کے گرد کوئی ہیرو کوٹ کے پھینک دیتا ہے۔“ کسی نے سرگوشی کی اور تاریکی میں دو روتی بسورتی آنکھیں ہزاروں شکوے لیے

اُبھر آئیں۔ نیلم کے شفاف ٹکڑے آنسوؤں سے نم ہو کے چمک رہے تھے۔ پلکوں پہ ٹھہرے آنسو ہیروں کی طرح جگر جگر کر رہے تھے۔ وہ مسکرا دیا۔ اچانک ان کے عقب سے دو اور آنکھوں نے جھانکا اور.....

”تمہاری آنکھوں کا رنگ بتاتا ہے کہ تم رورہی تھیں۔“ کسی نے ان بھوری آنکھوں میں پھیلے لال ڈورے دیکھ کے کہا۔ وہ ڈر گیا، خوفزدہ ہو گیا۔ دونوں ہاتھ چہرے پہ چھپا کے چلانے لگا۔

”اسی لیے..... اسی لیے مجھے بُری لگتی ہیں یہ یادیں وہ سب بھی یاد دلا دیتی ہیں، جنہیں بھلانے میں اتنے سال لگے ہیں۔“

ساتھ لاتی ہے ایک ایک منظر
یاد کچھ بھول کے نہیں آتی

☆☆☆

”کہاں جا رہے ہیں آپ اتنی صبح صبح“ خان دراب خشک کو صبح صبح جانے کی تیاریوں میں مصروف دیکھ کے ان کی بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

ظاہر ہے ان کا اتنا سویرے جاگنا اور پھر اتنے اہتمام کے ساتھ باہر نکلنا، خلاف معمول جو تھا۔ وہ بدستور اپنے کام میں مشغول رہے تو زبیدہ خانم جھنجھلا گئیں۔ جیسے ہی وہ کون لوہ کر کے پلے تو بیگم کو راستے میں پھر موجود پایا۔

”اب کیا ہے؟“ وہ اپنے مخصوص اکھڑ لہجے میں بولے۔

”شکار پر آپ نہ تو اکیلے جاتے ہیں نہ ہی اتنی رازداری کے ساتھ پھر.....؟“
”بڑے لالہ کے پاس جا رہا ہوں، اسلام آباد۔ انہوں نے کسی کام سے بھیجنا ہے مجھے۔“
”انہیں آپ سے کیا کام ہو سکتا ہے، یا یوں کہیے کہ آپ ان کا کیا کام کر سکتے ہیں؟“
”بھلا اور پھر نہ رازداری نہ گارڈ..... یوں فجر سے بھی پہلے روانگی کا کیا مطلب ہے۔“ ان کی کسی طور تسلی نہ ہوتے دیکھ کے دراب زنج ہو گئے۔

”گارڈ کے ساتھ نکلا تو لوگ متوجہ ہو جائیں گے۔ اکیلے زیادہ رازداری کے ساتھ پہنچوں گا۔ بڑے لالہ کی خاص ہدایات ہیں کہ ملازمین تک کو علم نہ ہو، میرے گھر سے نکلنے کا۔ خود وہ بھی سارا دن آفس میں مصروف رہیں گے تاکہ سب کو یہ تاثر ملے کہ ہم دونوں بھائی سارا دن اپنے اپنے کام میں مصروف رہے ہیں اور زریاب لالہ کو.....“

”کہاں ہیں زریاب لالہ؟ کب آئے وہ؟“ زبیدہ بے تابی سے اور آگے بڑھیں۔

”آہستہ زبیدہ آہستہ“ وہ ڈپٹ کے بولے۔

”ابھی نہیں آئے وہ، کل آنا ہے انہیں۔ لیکن بڑے لالہ نے اپنے ذرائع استعمال کر کے انہیں آج ہی لانے کا انتظام کر لیا ہے۔ کل دشمن گھات لگائے بیٹھے ہوں گے۔ بلکہ وہ تو کئی روز سے چوکنے ہیں اس لیے آج بھی انہیں لانے کے لیے اتنی رازداری اور احتیاط برتی جا رہی ہے۔“

”ہائے اللہ۔“ وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ گئیں۔

”اب کیا ہوگا؟“

”کچھ نہیں ایک بار لالہ خیریت کے ساتھ ہو چکی ہیں۔ پھر کس کی حیرت ہے جو انہیں نقصان پہنچا سکے۔ آگے کے لیے بھی بڑے لالہ نے کافی کچھ سوچ رکھا ہے وہ انہیں دشمنوں کی پہنچ سے دور بہت دور پہنچا دیں گے۔ یہاں تو وہ صرف انہیں باچا جان کی تسلی کے لیے لارہے ہیں۔“

”اور آپ..... آپ اکیلے اتنے خطرناک کام.....“

”کوئی خطرناک کام نہیں، یہ فرض ہے میرا۔ صرف احتیاط سے کام لے رہے ہیں ہم لوگ۔ ورنہ ایسی بات نہیں کہ خٹک خاندان اب ہڈیاں کھنکھاتے ہوئے ہیں۔ میرا بھائی آرہا ہے اور میں اسے بحفاظت گھر لانے کے بجائے اپنے بچاؤ کے طریقے سوچنے بیٹھ جاؤں۔ تف ہے تم عورتوں کی بزدلی پر اور خبردار.....“ وہ پھر پلٹے۔ ”خبردار ابھی گھر کے کسی فرد کو یہ علم نہیں ہونا چاہیے۔“

☆☆☆

”کیا کہا؟ پھر سے کہنا.....“ شاور چونک کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میری ماما! جیسا کہ تم لوگوں کی قیاس آرائیاں ہیں، انگلش یا جرمن نہیں، کالاں کی رہنے والی ہیں۔ وہ اس خاندان کا حصہ نہیں لیکن اسی وطن کے ایک خوب صورت پہاڑی خطے کی رہنے والی ہیں اور وہ مسلمان بھی ہیں، پیداؤشی مسلمان..... مومنہ علی..... مومنہ زریاب خٹک۔“

اس نے دوبارہ زیادہ تفصیل سے بتایا۔ شاور کھوئی کھوئی کیفیت میں بیٹھی رہی۔ مقدس کے لیے اس کا رد عمل حیرت انگیز تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو وہ اس سے پوچھ رہی

تھی کہ ڈائری سے اس کی معلومات میں کیا اضافہ ہوا تب وہ ہنس ہنس کے بتانے لگی۔

”بے حد اضافہ ہوا میری معلومات میں دیر اور چترال میں مچھلی کا شکار کرنا اور جھیلوں میں نہانا منع ہے۔ سوات کا رقبہ ۸۷۸۸ مربع کلومیٹر ہے اور آبادی بارہ لاکھ ہے۔ چترال سے ایوان کے رستے کالام میں داخل ہوا جاتا ہے، وادی بمبوریت پر داخلہ ٹیکس پندرہ روپے ہے اور.....“

”ہیں..... ہیں..... یہ کیا اول فول بک رہی ہو۔“ وہ مشتبہ نظروں سے اسے گھورنے لگی۔

”اور سنوٹاں..... وہاں کی اپنی زبان میں بمبوریت کو مرمریت، ہرو اور بری لاکتے ہیں اور وہ جوان کا روایتی لباس ہوتا ہے ناں عورتوں کا کرتے کو۔“ پوش“ کمر کی پٹی کو“ مشوشت“ اور ٹوپی کو“ کوہی“ کہتے ہیں اور.....“

”اشاپ اٹ مقدس تم انہیں بتانا چاہتیں تو نہ بتاؤ۔ لیکن یہ کافرستان کا سفر نامہ تو ست سناؤ۔“ وہ باقاعدہ ناراض ہو گئی۔

”جو پڑھا ہے وہی سنا رہی ہوں، ڈیئر، میری ماما بابا جان کو انہی پہاڑوں میں ملی تھیں۔“ مقدس نے مختصر اتمام کہانی اسے سنا ڈالی۔

”مومنہ علی..... مومنہ زریاب..... مومنہ.....“ شاور بے یقینی سے بڑبڑاتی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے پھر سر جھٹک کے کہنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مقدس حیرت سے اس کا اضطراب نوٹ کر رہی تھی۔ شاور کے چہرے پہ فیصلہ کن کاشحات پیدا ہوئے اور وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

”مومنہ مقدس! میں پورے وثوق سے تو نہیں کہہ سکتی لیکن میرا خیال ہے کہ میں تمہاری ماما کو چاڑی ہوں۔“

”کیا.....؟“ وہ فرط حیرت سے اچھلنے کو تھی کہ شاور نے اس کے ہاتھ تھام کے پھر سے بٹھایا۔

”آرام سے بیٹھ کے سنو۔ میں نے ایک بار تمہیں بتایا تھا ناں کہ ہمارے ہاسپٹل میں ایک ملازمہ..... میرا مطلب ہے ایک عورت ہے جس کی شکل و صورت تم سے حد درجہ مشابہ ہے۔ تمہاری آنکھوں کی ساخت، چہرے کی بناوٹ، بالوں کی رنگت، ایک ایک نقش حتیٰ کہ آواز اور مسکراہٹ بھی بالکل ایک جیسی ہے۔ میری اس بات کو اس وقت تم نے مذاق

میں اڑا دیا تھا خود میں بھی اسے زیادہ سیرکلی نہیں لے رہی تھی اس لیے بھول بھال گئی۔ اب تم نے جو بات بتائی ہے تو رہ رہ کے وہی چہرہ میری نگاہوں میں آ رہا ہے وہی شہد رنگت آنکھیں، سروقد، وہی رخسار اور ٹھوڑی پہ گودے تل اور نام، اس کا نام بھی مومنہ ہی ہے۔ ہم سب انہیں اماں مومنہ کہتے ہیں۔“

”کیا واقعی؟ پھر تو وہ..... کیا پتہ وہی.....“ اس کے لبوں سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کے نکل رہے تھے۔

”ہاں شاید وہی..... اور شاید وہ نہ ہوں۔ تم ہر بات کے لیے خود کو تیار رکھو۔“ شاور نے اس کے کپکپاتے وجود کو سہلایا۔

”میں اسی لیے یہ بات تمہیں بتانے میں ہچکچاہتی تھی۔ میں یہ تو نہیں جانتی کہ وہ کیلاش کی ہیں یا نہیں لیکن پٹھان ہیں یہ بات سب ہی جانتے ہیں۔ رواں اور شستہ اردو بولنے کے باوجود کہیں کہیں پشتو لب و لہجہ جھلک رہا جاتا ہے اور ان کی شکل و صورت، سب انہیں پٹھان ہی ظاہر کرتے ہیں۔ خصوصاً چہرے پہ گودے تل جو نمونہ سرحد کی پہاڑی دوشیزاؤں کی نشانی ہیں۔ اسی لیے تمہارے ذکر کرتے ہی میرے تصور میں فوراً ان کا ہی چہرہ آیا۔ لیکن پتہ نہیں میں نے تمہیں بتا کے صحیح کیا یا غلط۔ میرا مطلب ہے ابھی یہ بات کنفرم تو نہیں ہے ناں یہ نام ایک ہی شخصیت کا تو نہیں ہو سکتا۔“

”نہیں شانو نہیں۔ تم ان کا ذکر کرتی ہو تو میرا دل تمہارے اک اک لفظ پہ ایمان لانے کو چاہتا ہے۔ یہ دل کہتا ہے شانو کہ وہی ماما ہیں وہی میری ماما ہیں۔“ وہ منہ بولا میں بولی۔

”مگر وہ نشان..... میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ اس کے چہرے پہ ایک طرف کا رخسار اور آنکھ کا نچلا حصہ پورا جلا ہوا ہے۔“

”جو بھی ہو..... میں جلد از جلد ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ تم ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ لاہور چلنے کی تیاری کرو۔“

”ابھی..... اسی وقت..... مگر کیسے؟“ شاور بولی۔

”ابھی کل ہی دراب ماموں نے پوچھا تھا کہ وہ کب ہماری واپسی کی تمکین بنوائیں۔ تو میں نے انہیں اگلے ہفتے کسی بھی دن کی تمکین بک کروانے کے لیے کہا تھا۔ ابھی تقریباً بارہ چھٹیاں باقی ہیں۔“

”لیکن میں ایک ہفتہ نہیں رک سکتی۔ مجھے آج نہیں تو کل ضرور لاہور جانا ہے۔“

”اتنی جلدی تمکین کیسے ملیں گی محترمہ۔“

”بائی روڈ چلے جائیں گے۔“ وہ مصرعہ۔

”بائی روڈ؟ پورے آٹھ گھنٹے کا سفر۔ نا بابانا۔“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”پلیز شانو..... پلیز..... تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتیں۔“ وہ منتوں پر اتر آئی۔

”میں تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتی ہوں، مقدس لیکن تم خود سوچو محض میرے ہائی

بھر لینے سے تم لاہور تو نہیں پہنچ جاؤ گی۔ بی بی جان کبھی ہمیں بائی روڈ اکیلے جانے کی اجازت

نہیں دیں گی اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم اپنے ہنگامی فیصلے کا ریزن کیا دیں گے۔“

”یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔ کم از کم تم ایک کوشش تو کر سکتی ہو۔ ویسے بھی بی بی جان

تمہاری ہر بات مان لیتی ہیں۔ تم ان سے بات کر کے تو دیکھو۔ کوئی بھی بہانہ بنا لو پلیز۔“

”اچھا بابا!“ اس کے مسلسل اصرار پہ وہ ہار مان کے بی بی جان کے پاس چلی آئی۔

”بی بی جان اور کیا وجہ ہونی ہے دراصل میں نے اور میری دوسری فرینڈز نے جس

ایگزیشن میرا مطلب ہے تصویری مقابلے میں حصہ لینا تھا اس کی ڈیٹ یعنی تاریخ مقرر ہو گئی

ہے اور ابھی ابھی شائستہ کا فون آیا تھا مجھے جلد از جلد وہاں پہنچنا ہے تاکہ اپنا نام لکھوا سکوں

ورنہ پھر میں اس مقابلے میں شامل ہونے سے رہ جاؤں گی۔ آپ پلیز ہمیں ڈرائیور کے

ساتھ کرنا دیجئے۔ میرا مطلب ہے مقدس بھی میرے ساتھ ہی چلی جائے اس کی بھی چھٹیاں

بائی ہیں لیکن مجھ سے اکیلے سفر نہیں کئے گا۔“

وہ جانتی تھی اس کا بہانا ایک دم بوگس اور فضول ہے، پھر بھی وہ بڑے دھڑلے سے بول

رہی تھی۔ مقابلے بی بی جان تھیں جہیں اس کے کالج کا پتا معلوم تھا نہ تعلیم کی خبر۔

انہیں کیا علم کہ ایسے مقابلے یوں ہی منعقد نہیں ہوتے اور نہ ہی اسکول میں ہونے

والے ٹیبلو پروگراموں کی طرح ان میں لائن میں لگ کے نام لکھوانا پڑتا ہے۔ پھر بھی وہ

بے یقین نہیں تھی کہ بی بی جان بھلے اس کی بات کا اعتبار کر لیں لیکن ضروری نہیں کہ اکیلے جانے

کی اجازت بھی دے دیں۔ اور اس وقت وہ حیران رہ گئی جب بی بی جان نے بغیر کسی سوال

کے کہہ دیا۔

”تم تیاری کرو۔ اگر ہو سکے تو نو بجے تک ڈرائیور کے ساتھ نکل جاؤ شام تک پہنچ جاؤ

گی ورنہ تیاری میں رہو ہونے کی صورت میں کل صبح سفر کرنا۔ میں نہیں چاہتی تم دوپہر کو نکلو اور

رات گئے ہاسٹل پہنچو۔“

”تھینک یو بی بی جان! ابھی تو بچنے میں پورا سوا گھنٹہ ہے۔ ہم تقریباً تیار ہی ہیں۔ آپ ڈرائیور کو کہلوادیتے،“ وہ بھاگتی ہوئی مقدس کو خبر سنانے کمرے سے نکلی اور بی بی جان نے سینے میں کب سے رکھا سانس خارج کیا۔

”اچھا ہوا مقدس کے یہاں سے جانے کا سبب بن گیا۔ ورنہ زریاب کے یہاں آتے ہی پھر سے..... اچھا ہی ہوا جو آتے ہی اسے یہ صورت دیکھنے کو نہ ملے گی ورنہ.....“

☆☆☆

”لالہ.....“ دراب نے بے تابی سے آگے بڑھ کے اسے گلے سے لگا لیا۔

”دراب تم؟“ وہ حیران تھا۔ اس نے تنہائی میں کسی اسنے کی موجودگی؟

اذیت و کرب کے تھپڑ سہتے وجود کو کسی کی مہربان بانہوں کا سہارا۔

اس نے حیرت سے خود کو اس کی بانہوں کی گرم جوش پناہ میں ڈال دیا۔

”تم یہاں کیسے؟“

”آپ کو لینے آیا ہوں لالہ.....“

”مجھے لینے؟ کیا اتنا وقت بیت گیا۔“ وہ حیران تھا کہاں تو سرخ سرخ کے بھی ایک

رات نہ گزرتی تھی۔ کانٹوں پہ چل چل کے ایک ایک پہرہ تپا تھا اور اب یہ کہہ رہا ہے.....

کہ میں سال گزر گئے۔

”چلیں..... لالہ، گھر چلیں۔“ اس نے بھائی کا ہاتھ تھام کے آگے بڑھنا چاہا۔

”گھر؟ چلو۔“ وہ یوں بولا جیسے اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ ہو۔

وہ بن ہو کے صحرا، دیوانے کو کہہ رہا تھا۔

زنجیر کھلی ہو تو پھر خاک اڑانا ہے

اور خان زریاب خشک برسوں بعد گندی بوسیدہ دیواروں، پیر زخمی کرتی بیڑیوں اور

سنگلاخ پتھروں والی زمین کی سنگت چھوڑ کے آزاد فضا میں آ گیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے

پیچھے مڑ کے دیکھا۔

”سینٹرل جیل پشاور۔“ کی تمام تر اذیتیں، تنہائیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔ سامنے کی

آزاد دنیا میں اس کے لیے اور بھی کچھ تھی..... کچھ اور امتحان..... کچھ اور اذیتیں.....

☆☆☆

عمران نگلیاں یہاں پار
ہالے نہ دس او کالیا
عمران نگلیاں یہاں پار

”یہاں بھی ڈھنگ کا کوئی گانا نہیں لگ رہا۔“

وہ پوری طرح سے اسد امانت علی خان کی پُر سوز آواز میں کھوئی ہوئی تھی جب شناور نے ایف ایم ون ہنڈرڈ بھی آف کر دیا۔

”کسی ایک جگہ تو ٹک جاؤ۔“ مقدس کو اس طرح اس کی مداخلت پہ اچھی خاصی

کوفت ہوئی۔

”میرا بالکل دل نہیں لگ رہا ان اچاز سنسان سڑکوں پہ تم بھی منہ لپیٹے بیٹھی ہو۔“

پیننگ بھی اس قدر افراتفری میں کی کہ کیٹش بھی لانا بھول گئی۔ آف کس طرح کئے گا.....

یہ سفر، ابھی پورے ساڑھے چار گھنٹے باقی ہیں۔“ اس نے باقاعدہ واویلا مچا دیا۔

”تو کوئی رسالہ ہی پڑھ کرلو۔“ اس نے سائیڈ پہ رکھے بیگ میں سے اکٹھے دو تین

ڈائجسٹ نکال کے اس پہ پھینکے۔

”یا پھر کچھ دیر سونے کی کوشش کرو میرا دماغ مت چاٹو۔“ وہ اس وقت واقعی بے حد

اُبھی ہوئی تھی، اسی لیے اس لہجے میں اس سے بات کر گئی، ورنہ شناور کی طبیعت کا بے صبرا

ہی اس کے لیے نئی چیز نہیں تھی۔ وہ بھی مقدس کی ذہنی کیفیت بھانپ کر چپ کر گئی لیکن مچلا

بھنکنا اس کی فطرت میں بھی کہاں تھا۔ چند منٹ منہ پھلا کے بیٹھنے کے بعد وہ ڈرائیور سے

پوچھنے لگی۔

”یہ کیا ہے ماما! اس قدر کواں کیسٹ رکھے ہوئے ہیں تم نے، نام بھی اتنے

ہولناک ہیں۔“ پختو پہ زہ کشم۔“ اور یہ کیا ہے ”شرنگ دا بگلزو۔“ مائی گاڈ کیا تصویر بنی

ہے اس کے کور پہ نام ہے۔“ ”خوڑے۔“

”وہ دو مجھے۔ سرہ لو پش۔“

”واللہ کیا ظالم ظالم گانا ہے اس میں۔“ اس نے سر ڈھنٹے ہوئے کیسٹ طلب کیا۔

”رہنے دو ماما! ہمیں نہیں یہ ظلم سہنا۔ اگر پشتو گانا سننا ہی ہیں تو بندہ رحیم شاہ یا پھر

سردار فکر کو سننے کیوں مقدس۔؟“ اسے آنکھیں موندے دیکھ کر وہ مایوس سی ہوئی۔ ”اب

کس سے سر پھوڑوں۔“ ایک آدھ سیکنڈ ہی خاموش بیٹھے رہنے کے بعد وہ پھر آگے کی

طرف جھکی۔

”اس سے تو اچھا ہے ایف ایم ون ہنڈرڈ ہی لگا لوں۔ غزلیں اور کافیاں ہی سہی۔“
گاڑی میں پھر سے وہی پُر درد لے مدھم مدھم سی ابھرنے لگی۔

کدے نہ سکھ سنبھا کہلایا

کدے نہ

ہائے کدے نہ

”خانہ خراب“ ایک جھٹکے سے گاڑی کے رکنے پہ اور نگزیب ماما جھنجھلایا ہوا سا باہر

نکلا۔

”کیا ہوا؟“ وہ دونوں بھی متفکر ہو گئیں۔

”ٹائر پچھڑ ہو گیا ہے بی بی!“ وہ چیک کرنے کے بعد پیچھے کی طرف مڑا۔
”چلو، کوئی بات نہیں۔ زیادہ سے زیادہ دس بارہ منٹ نہیں کے ٹائر چنچ ہونے

میں۔“ ان دونوں نے ایک دوسرے کو تسلی دی۔

”اوئے خانہ خراب کا بچہ۔ کسی چرسی کی اولاد پھر دغا دے گیا۔“

”اب کیا ہوا؟“ وہ دونوں بیک وقت شیشے نیچے کر کے باہر سر نکالتے ہوئے

چلائیں۔

”وہ خبیث رمضانی نہیں ہے، اس کو میں بولا بھی تھا گاڑی چیک کرنے کے واسطے،

یہ چیک کیا ہے اس خانہ خراب نے؟ پچالتو (فالتو) ٹائر مائر بھی نہیں رکھی۔“

”تمہاری تو پرانی عادت ہے ماما۔ اپنی غلطی دوسروں کے سر تھونے کی، کار تمہیں

ڈرائیو کرنی تھی، تمہیں خود سب انتظام کرنا چاہیے تھا۔ وہ چرسی ہے تو سب اس کا انتظام

ہوا ہے؟“ شناور کے ڈپٹے پہ وہ چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا۔

”ظالم ظالم گانوں والے یہ الم ظلم کیسٹ بھرنے یاد تھے، ایک اسپئر ٹائر نہیں رکھ سکتے

تھے۔“

”اب بس بھی کرو۔ یوں سر راہ چلانے سے کچھ ہو جائے گا کیا؟“

مقدس نے ناگواری سے اسے دیکھا جو کمر پہ لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ جما کے بازو

نجاتے ہوئے اور نگزیب کی خبر لے رہی تھی۔ آس پاس سے گزرتی گاڑیاں کچھ دیر کے

لیے آہستہ ہو جاتی تھیں ان کے قریب سے گزرتے ہوئے۔ مقدس کو بھی فکر تو ضرور تھی

لیکن اس طرح سڑک پہ تماشا بن جانے کا خوف زیادہ تھا۔ وہ پھر سے آوازیں دے کے
اسے گاڑی میں بیٹھنے کے لیے بلانے لگی۔ ایک سلور گرے کرولا کی اسپرڈ بھی سلو ہو گئی ان
کے پاس آتے ہی، مگر دوسرے لوگوں کی طرح گردن باہر نکال کے محض صورت حال کا
جائزہ لے کر گاڑی آگے بڑھالے جانے کے بجائے اس شخص نے ان سے ذرا آگے
سائیڈ پہ کار پارک کی اور خود ان کی طرف بڑھ آیا۔

”ایچی براہلم؟“ بے حد شائستہ انداز میں اس نے شناور سے پوچھا۔ جو غصے سے
تمتمایا چہرہ لیے مسلسل ڈرائیور کو گھور رہی تھی۔ غصے کی زیادتی نے اسے ڈھنگ سے اس
اجنبی کی بات کا جواب بھی نہیں دینے دیا۔ وہ محض بڑبڑا کے رہ گئی۔

”وہ ٹائر پچھڑ ہو گیا ہے صیب اور پچالتو مائر بھی نہیں۔“ اور نگزیب منمنایا۔

”اوہ آپ پریشان مت ہوں مس۔ اپنی سیٹ پہ آرام سے بیٹھیے جا کر، میں ٹائر
دے دیتا ہوں آپ کے ڈرائیور کو۔“ وہ گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ پیچھے پیچھے باجھیں پھیلاتا
ہوا اور نگزیب بھی لپکا۔

”ماما ایک منٹ“ مقدس نے پرس میں سے کچھ روپے نکالے۔ ”شناور یہ ماما کو پکڑا

دو۔ ٹائر کی قیمت ادا کر کے پھر لیں۔“

”اکیسکیو زمی مس! یہ آپ نے بھجوائے ہیں؟“ وہ نوٹ لہراتا پھر شناور کے سر پہ

موجود تھا۔ میں ٹائروں کی خرید و فروخت کا کام بالکل بھی نہیں کرتا۔ بالی پروفیشن، میں

ایک کیڑا ہوں۔ اگر آپ کو ٹائر خریدنا ہی ہے تو میں آپ کے ڈرائیور کو چند میل آگے

میں اسٹیشن پہ ڈراپ کر دیتا ہوں۔ لیکن..... یہ سوچیے کہ آپ کا یوں تنہا اس کے انتظار

میں رہنا مناسب ہوگا؟ یہی ہنر ہے کہ آپ یہ ٹائر لے لیں پلیز۔“

”دیکھیے ہم لوگ اس وقت آپ کی مدد لینے پہ مجبور ہیں، لیکن پھر بھی..... بغیر قیمت

ادا کیے یہ ٹائر لینا بھی ہمیں گوارا نہیں۔“ مقدس باہر نکل آئی۔ اسے دیکھ کے وہ یوں چونکا

جیسے گاڑی میں اس کی موجودگی سے بے خبر ہو۔

”اس طرح آپ کا یہ عمل مدد نہیں احسان کہلائے گا اور کسی کا احسان لینا ہماری

روایات کا حصہ نہیں۔“

اس کے مضبوط لہجے اور پُر اعتماد انداز سے محفوظ ہو کے وہ مسکرایا۔

”اور خواتین کی مدد کرنے کا معاوضہ وصول کرنا ہماری روایات کا حصہ نہیں۔ بہر حال

آپ کے اصول بھی مقدم ہیں ہمیں۔ آپ یوں کیجئے یہ میرا کارڈ رکھ لیں اور جب آپ کا مسئلہ حل ہو جائے میرا ٹائر مجھے واپس لوٹا دیجئے گا۔ شکریے کے ساتھ۔“ وہ اس کی میلی آنکھوں کی الجھن محسوس کر کے مسکرایا۔

”نہیں خیر، شکریہ تو ہمیں ابھی بھی آپ کا ادا کرنا چاہیے۔“ شناور کو آداب یاد آگئے۔

”اوئے خانہ خراب۔“ اور نگزیب نے پھر وہائی دی۔ ”یہ تو دو ٹائر پتھر پڑے ہیں۔“ ”اوہ نو!“ ان تینوں کے منہ سے افسوس بھرے انداز میں ادا ہوا۔ مقدس تو مایوس سی ہو کر دوبارہ سے گاڑی میں بیٹھ گئی، جب کہ شناور ذرا آگے ہو کے گزرتی گاڑیوں کو اُمید بھرے انداز میں دیکھنے لگی کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ مزید ایک ٹائر دیے کے لیے آجائے۔

”بی بی۔“ اور نگزیب تیزی سے اس کی طرف الجھنے لگی۔ ”مجھے تو تم اپنی شکل ہی نہ دکھاؤ ماما۔“ اس کے دھاڑنے پہ وہ سہم کر مقدس کی طرف بڑھا۔

”بی بی تم ہی سن لو امارا بات۔“ ”ہاں بولو۔“ موڈ تو اس کا بھی خاصا خراب تھا لیکن سننے لگی کہ اب کیا مژدہ سنا تا ہے، ماما اور نگزیب خان۔ شناور بھی سن گن لینے پاس کھڑی ہوئی۔

”وہ ڈاکٹر صیب (ڈاکٹر صاحب) کہتا ہے کہ ام تینوں اس کی گاڑی میں بیٹھیں۔ وہ آگے کوئی ہوٹل موٹل ہے وہاں تک چھوڑ دیے گا۔ بی بی لوگ آرام سے بیٹھ کے اور (ادھر) چائے مائے پیے گا اور ام ٹائر لے کے واپس یہاں آئے گا۔“ شناور نے پانچ نکاتی منصوبہ تفصیل سے دہرایا۔

”چلو یہ مسئلہ تو حل ہوا۔“ شناور نے سکون بھری سانس لی۔ ”لیکن ہم کیسے کھلی اجنبی کے ساتھ چل پڑیں۔“ مقدس کو اعتراض تھا۔

”بی بی کوئی پندرہ منٹ لگیں گے، بس ہوٹل تک جانے میں اور پھر ام ہے ناں تمہارے ساتھ۔“ اس نے تسلی دی۔

”میرا خیال ہے مقدس یہی بہتر ہے۔ یہاں اکیلے موٹر وے پہ کھڑا ہونا بھی تو ناممکن سی بات ہے۔“ اس کے کہنے پہ وہ مزید پس و پیش کرنے کے بجائے اپنا شولڈر بیک

اٹھائے چادر درست کرتی باہر نکل آئی۔

”بی بی تم لوگ بھکر (فکر) مت کرو۔ ڈاکٹر صیب شریف آدمی ہے اور پختو (پشتو) بھی بولتا ہے۔“

وہ پختو بولتا ہے یا نہیں یہ تو پتا نہیں چل سکا۔ اتنا اندازہ ضرور ہو گیا ان دونوں کو کہ ڈاکٹر صیب واقعی شریف بندہ ہے۔ بارہ منٹ کی ڈرائیو میں اس نے بالکل بھی دونوں لڑکیوں کو مخاطب نہ کیا، البتہ کافی شاپ میں اس کی دی گئی کافی اور اسٹیکس کی پیش کش شکریے کے ساتھ واپس لوٹا دینے پہ وہ چپ نہ رہ سکا۔

”یہ تو آپ میری مہمان نوازی کو گھٹس پہنچا رہی ہیں محترمہ!“ ”لیجئے خواجواہ ہی۔ ہم بھلا آپ کے مہمان کیسے ہو گئے۔“ شناور بحث پہ اتر آئی۔

کوئی آپ کے گھر تھوڑا ہی بیٹھے ہیں۔“ ”ضروری نہیں کہ گھر آنے والا ہی مہمان ہو۔ آپ میری گاڑی میں بیٹھ کر یہاں تک آئی ہیں۔ میری نظر میں اس وقت آپ میری معزز مہمان ہیں اور آپ کی تواضع کرنا میرا فرض ہے“ اس کے پاس بھی جواب حاضر تھا۔

”معاف کیجئے گا، آپ کی مدد اور تعاون کے لیے ہم واقعی شکر گزار ہیں، لیکن یہ ہماری بھوری تھی ورنہ جس خاندان سے ہمارا تعلق ہے وہاں لڑکیاں اجنبیوں سے تواضع نہیں کرتی پھرتیں۔“ اب کی بار مقدس اپنے مخصوص سنجیدہ اور دو ٹوک انداز میں بولی تو وہ سنی گئی ہو کر یوں مسکرایا جیسے اب تک کی بلا مقصد بحث محض اسے بولنے پر اُکسانے کی ایک کوشش ہو۔

بجائے مایا آپ نے۔ اجنبیوں سے گریز اچھی بچیوں کا شیوہ ہے لیکن.....“ وہ لطف لینے کا مقدس کی برہمی کا۔ ”اگر وہ واقعی اجنبی ہو تو.....“

مقدس سر اپا مل گئی اس کے فخرے پہ، اس نے پہلی بار نظر اٹھا کے سامنے بیٹھے خوش قامت و خوش لباس شخص کو بغور دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں استفسار پڑھ کے وہ مسکرایا۔

”آپ کے بیگ میں میرا کارڈ موجود ہے۔ اس لحاظ سے تو آپ کو مجھے اجنبی نہیں کہنا چاہیے۔“ مقدس کا دایاں ہاتھ بے ساختہ اپنے بیگ کی طرف سرک گیا۔ اسے یاد آیا بے دھیانی میں اس نے یہ کارڈ بغیر دیکھے ہی بیگ کے اندر ڈال لیا تھا۔ وہ بھی شاید اس کی بے اعتنائی جان چکا تھا اس لیے اپنا باقاعدہ تعارف کروانے لگا۔

”مجھے ڈاکٹر خوشنود کہتے ہیں۔ ایوب میڈیکل کالج ایبٹ آباد میں اعزازی طور پر تعینات ہوں۔ اس کے علاوہ اسلام آباد میں اپنا ایک ذاتی کلینک بنانے کا ارادہ ہے۔ آج کل اسی کے سلسلے میں کچھ مصروفیات ہیں۔ لاہور میں ایک ذاتی نوعیت کے کام سے جا رہا ہوں۔ آپ لوگ بھی شاید لاہور ہی جا رہی ہیں۔“ ان کا تعارف لینے کے بجائے اس نے سرسری سا ایک سوال کیا اور اثبات میں جواب ملنے پر خاموشی سے کافی پینے لگا۔ اگرچہ اس نے دوبارہ ان سے اصرار نہیں کیا تھا لیکن اس طرح اکڑ کر بیٹھے رہنا کم از کم شنوار سے گوارا نہیں ہوا اور اس نے بھی اپنا گل اٹھالیا۔ مقدس نے ایک نظر سامنے بیٹھے اس نفیس طبع شخص کو دیکھا جو اس وقت گرد و پیش سے لاپرواہ نظر آتا ہوا کافی اور اخبار سے شغل فرما رہا تھا اور جس نے تکلفاً بھی ایک بار اپنے سامنے بیٹھی لڑکیوں کا نام نہ لیا تھا۔ اس کے ہاتھ خود بخود اپنے سامنے رکھے بھاپ اڑانے لگ کی طرف اٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر میں اور نگزیب سامنے سے آتا نظر آیا۔

”گاڑی آگیا ہے بی بی! وہ جن بس والوں نے ام کو الٹ دیا تھا انہوں نے ٹائر بدلنے میں بھی مدد کر دیا اسی لیے ام جلدی واپس آگیا۔“

”شکر ہے اللہ کا۔“ دونوں جلدی جلدی اپنے بیگ اور پرس سنبھالنے لگیں۔

”آج زندگی میں پہلی بار میں نے اور نگزیب ماما کی صورت دیکھنے کے بعد شکر کا کلمہ پڑھا ہے۔“ شنوار اس کے کان میں گھس کر بولی تو باوجود اس قدر سناو کے بھی وہ مسکرا دی۔ خوشنود نے دلچسپی سے سرمئی گرم شال کے ہالے میں لپٹے اس صبح چہرے پر پھونتی مسکراہٹ کی کرن دیکھی۔

”جئے اُس کے؟“ (چائے پیو گے) اس کی آفر پر وہ ہلکے سے ہنس کر ہاتھ دھو کر چاہتا تھا، لیکن شنوار کی گھوریوں سے گھبرا کے نفی میں سر ہلاتا ہوا بیگ اٹھالے لگا۔ خوشنود ایک طرف بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ گاڑی میں بیٹھ رہی تھیں اسے ہاتھ میں ڈسپوز ایبل کپ پکڑے اس طرف آتے دیکھا۔ اس نے زبردستی اور نگزیب کو چائے پکڑائی۔ شنوار کے دوبارہ شکر یہ ادا کرنے پر بھی مقدس چاہنے کے باوجود اسے تھینک یو تک نہ کہہ سکی۔

☆☆☆

”کون؟ وہ پٹھانی؟“ ان کے پوچھنے پر ہاشل وارڈن نے سوال کیا۔

”جی میڈم وہی، کیا آپ بتا سکیں گی اس وقت وہ کہاں ملیں گی؟“

”تم لوگوں کو اس سے کیا کام ہے؟“ انہوں نے الٹا تعیش شروع کر دی۔

”کتنی بار تم لڑکیوں کو تائید کی ہے کہ اسٹاف کے ساتھ اس قسم کی عنایتیں وغیرہ مت کیا کرو۔“ یقیناً تم نے اسے کچھ رقم ادھار دی ہوگی اور اب وہ تمہارے ہاتھ نہیں لگ رہی۔“

”نو میڈم ایسی بات نہیں۔ ان سے کچھ اور کام تھا مجھے۔“ شنوار ان کی مسلسل جھٹ پہ زبج ہو گئی۔

”آپ پلیز انہیں بلوادیں یا مجھے بتادیں وہ اس وقت کہاں ہوں گی۔“

”وہ تو پچھلے ایک ہفتے سے غیر حاضر ہیں۔ پرسوں اطلاع ملی تھی کہ کچھ بیمار وغیرہ ہے، شاید کسی ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے۔ مجھے کچھ صحیح علم نہیں ہے۔“ وہ گول مول جواب دے کے ٹیلی فون پر کوئی نمبر پیش کرنے لگیں۔

”کون سے ہاسپٹل میں؟ کیا ہوا ہے انہیں؟“ مقدس جواب تک خاموشی سے کھڑی دونوں کے چہرے بازی بازی تک رہی تھی، بے صبری سے کہہ اٹھی۔ وارڈن نے ناگواری سے اسے دیکھا اور ماؤ تھ پٹیں یہ ہاتھ رکھ کے بولیں۔

”میں نے کہا ناں، مجھے علم نہیں۔ تمام ملازمین کی مزاج پرسی اور عیادت میری ڈیوٹی میں شامل نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ ہاں عرفانہ۔۔۔۔۔۔ کیسی ہیں آپ، ایک کام کہا تھا آپ سے۔۔۔۔۔۔ وہ درخ مہر کے مکمل طور پر فون پر متوجہ ہو گئیں جو اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ کسی اور سوال کا جواب دینے کے موڈ میں نہیں۔ شنوار نے شانے اچکا کے خود پہ ضبط کرتی مقدس کو دیکھا اور اس کا ہاتھ تھام کے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

”ایک منٹ ٹھہرو۔“ وارڈن کی آواز پر وہ چونک کر مڑیں۔ ”اماں برکتے۔۔۔۔۔۔ یہاں آنا۔۔۔۔۔۔ ذرا ان لڑکیوں کے ساتھ باہر جا کر بات کر لو اور ہاں شنوار یہ اماں اس پٹھانی کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ اس سے پوچھ لو جو بھی پوچھنا ہے۔“ بڑی غلٹ میں انہوں نے ریسیور کان سے لگائے ہوئے معاملہ بھگتایا۔

”کی گل اے کڑیے۔“ اماں برکتے شنوار کو جانتی تھیں اس لیے براہ راست اس سے سوال کیا۔ وہ تینوں اس وقت خنک اور قدرے تاریک کوریڈور سے گزر کر بیرونی دروازے کے ساتھ بنے احاطے میں کھڑی تھیں۔ چمک دار دھوپ نے ایک دم سے سامنے آ کر آنکھوں کو چندھیادیا تھا۔

”اماں وہ جو بچن میں ایک خوبصورت سی گوری چٹی اماں ہوتی ہیں، اماں مومنہ، وہ کہاں ملیں گی اس وقت؟“

”کیوں؟ تمہیں کیا کام ہے؟“ اُف پھر وہی سوال۔

”کام ہے تو پوچھ رہے ہیں ناں“

”اوہ تاں بیمار ہے..... (وہ تو بیمار ہے)

”کیا ہوا ہے انہیں؟“ مقدس کو اس اُن دیکھی عورت کی بیماری بے چین کر رہی تھی۔

”ایہہ.....“ (یہ.....؟) اماں برکتے نے آنکھوں پہ ہاتھ کا چھبنا کر اسے بغور

دیکھا۔ اس کی سخت مزاج آنکھوں میں تعجب کے رنگ واضح نظر آنے لگے۔ شاید اسے

اسے پھر اپنی جانب متوجہ کیا۔

”کیا کسی ہاسپٹل میں ہے؟“

”میں نہیں پتہ۔“ وہ یکا یک واپس مڑنے لگی۔

”ایک منٹ اماں..... رکیں تو سہی.....“ وہ رکت گئی لیکن شناور کے مقابل کھڑے

ہونے کے باوجود اس کی آنکھیں بار بار مقدس کے سر پر اٹھنے ہوئے وجود پر ہلک

جاتی تھیں۔

”آپ دونوں ایک ہی کوارٹر میں رہتی ہیں۔ کئی سالوں سے ایک ساتھ ہیں۔ یہ

کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ ان کے بارے میں بالکل بھی کوئی خبر نہ رکھتی ہوں، کہ وہ کہاں

ہیں، کس حال میں ہیں۔“ شناور کے جرح کے انداز پہ اماں برکتے ہلک گئیں۔

”اپنا کام کر کڑیے۔ تیرا کی مطلب پٹھانی سے وہ کدر ہے کدر رہا ہے تمہیں کیا؟“

”اماں ناراض مت ہو۔ دراصل دو سال سے انہیں دیکھتی آ رہی ہوں۔ ہسپتال

میں رہنے والی لڑکیوں کے لیے تو آپ اور دیگر لوگ ہی گھر کے افراد جیسے ہوتے ہیں

ناں۔“ وہ چالپوسی پہ اُتر آئی۔

”بس ان کی بیماری کا سنا تو پریشانی سی ہوئی۔ آپ سے اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ

شاید انہیں کسی مدد کی ضرورت ہو۔ آخر انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ اگر آپ بتا دیں

کہ وہ سر ہسپتال میں ہیں تو میں انہیں دیکھ بھی آؤں گی اور علاج معالجہ وغیرہ کے سلسلے

میں کچھ مدد بھی کروں گی۔ بس اتنی سی بات ہے۔“ اس کے چہرے پہ پہلی کمال معصومیت

اور لہجے کی انتہا درجے کی مٹھاس شاید اماں برکتے کو موم کر دیتی، لیکن سامنے کھڑی مقدس کا

متشکر چہرہ اور مضطرب انداز میں چٹتی انگلیاں باور کر رہی تھیں کہ بات اتنی سی نہیں۔

”مینیوں بچی نہیں پتا، اوہ کیسے لوں وسدی وی نہیں سی اپنی کوئی گل۔ پر میرا خیال

اے اوہ بن واپس آن نہیں جے گی۔ ہو رہے اپنے پنڈ چلی گئی ہوئے۔“ (مجھے واقعی نہیں

پتا، وہ کسی کو بتاتی بھی نہیں تھی، اپنی کوئی بات۔ لیکن میرا خیال ہے وہ اب واپس نہیں آنے

والی۔ شاید اپنے گاؤں چلی گئی ہو) وہ تیز تیز قدموں سے واپس اندر کی طرف چلی گئی۔

”کیا کہہ رہی تھیں؟“ اسے ایک لفظ نہ ملے پڑا۔

”شاید وہ واقعی نہیں جانتیں۔“

”نہیں شانو، انہیں سب پتا ہے، صاف نظر آ رہا ہے کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش

کر رہی ہیں۔ لیکن تو شانو کو بھی پتا تھا لیکن اس نے اس کی تائید کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

”اگر پتا ہوتا تو پتہ لگا دیتا۔ ہم سے کیوں چھپاتیں۔“ وہ ہر صورت اس کا دھیان بنانا

چاہتی تھی۔ لیکن اس کی سوئی بار بار اماں برکتے کی کھوجتی نظروں پہ انگی ہوئی تھی۔

”پھر وہ مجھے یوں کیوں دیکھ رہی تھیں۔ مجھ پہ نظر پڑتے ہی ان کے چہرے کے

تاثرات بدل سے گئے تھے، شانو کو کہہ رہی تھیں ناں کہ میرے اور ان کے چہرے میں

بے حد مشابہت ہے تو کیا اس لیے؟“

”ہو سکتا ہے..... لیکن اس مشابہت کو بہت کم لوگ محسوس کر سکتے ہیں، خصوصاً وہ جو

تمہیں یا ان خاتون کو بہت قریب سے جانتے ہوں۔ جب میں نے پہلی بار انہیں دیکھا تو

اس چہرے کے عین نقش مجھے چونکا گئے تھے کیونکہ برسوں سے ان نقوش سے میری واقفیت

رہی ہے۔ اسی طرح چونکہ اماں برکتے، اماں مومنہ کے ساتھ گزشتہ کئی سالوں سے رہتی چلی

آ رہی ہیں اس لیے تمہاری صورت دیکھ کے انہیں پہچنا تو ہوا ہی ہوگا۔ ورنہ سرسری سا

دیکھنے پہ یہ مشابہت یوں محسوس نہیں ہوتی کہ ایک تو عمر کا فرق، دوسرے ان کے چہرے کا

ایک تہائی حصہ خاصا جلا ہوا ہے۔“

”اور..... اور..... یہ چہرہ کس نے جلایا ہوگا؟“ اس نے جیسے ہواؤں سے سرگوشی کی

تھی۔

”پلیز مقدس..... ان سوالوں میں خود کو مت الجھاؤ۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی

ہوں کہ ہم یہاں ایک امید لے کے آئے ہیں۔ اچھے ہوئے دھاگے کا ایک سراڈھونڈنے

لیکن جب تک کوئی بات واضح نہ ہو جائے تم یہ فرض کر کے مت بیٹھ جاؤ کہ وہی تمہاری ماما

ہیں۔“ اسے تابعداری سے سر ہلاتے دیکھ کے اسے ذرا تسلی ہوئی۔

”اور ہاں اکیلے مت جانا ہاسٹل، مجھے لائبریری میں بس دس منٹ کا کام ہے۔ میں فارغ ہو کے آتی ہوں تو اکٹھے ہی نکلتے ہیں۔ تمہیں وہاں چھوڑ کے میں زارا کی طرف جاؤں گی۔ اس کے ساتھ ایگزیشن کے کچھ معاملے نمٹانے ہیں۔“

اسے آڈیو ریم کی سنسان سیڑھیوں پہ گم سم بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ خشک چوں کے کراہنے کی آوازیں اس کے خالی دماغ میں گونجیں پھر ایک بھاری مردانہ آواز اسے غائب الدماغی کی کیفیت سے مکمل طور پر نکال لائی۔

”السلام علیکم“ اس نے گرد آلود سیڑھیوں پہ انگلی سے لائیں کھینچنے کا شغل ترک کر کے سامنے نظر اٹھائی۔ چند لمحے اسے انجان نظروں سے دیکھنے کے بعد وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔

”آپ.....؟..... یہاں“

”جی..... میں ڈاکٹر خوشنود..... اور یہاں۔“ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی رنق پاک کے وہ ریلیکس سا ہو کر وہیں ذرا فاصلے پہ بیٹھ گیا۔ ”بڑی کمزور یادداشت ہے آپ کی۔ محض چوبیس گھنٹے پہلے ہونے والی ملاقات بھی آپ کے ذہن سے محو ہو گئی۔“

”جی نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ اب اسے قہر سے دیکھتا ہوا اس وقت کن طوفانوں کی زد میں ہے۔ وہ تو ابھی خود کو پہچاننے کے مراحل سے گزر رہا ہے، کسی دوسرے کا حوالہ کیا یاد رکھے۔ ”دراصل میں آپ کو یہاں دیکھ کے حیران ہوئی تھی۔ آپ تو ڈاکٹر ہیں ناں پھر یہاں۔“

”میں ایک ذاتی کام سے آیا تھا۔ آپ یہاں پڑھتی ہیں۔“ اس کے ہاتھ کاٹھن سے پیچھے سے آتی شناور نے دیا۔

”جی نہیں، یہ بھی یہاں ایک ذاتی کام سے آئی ہیں۔ نجانے اس ملک کے ڈاکٹروں کو ہم فنکاروں سے کیا کام پڑ گئے ہیں۔“

”السلام علیکم“

”شکر ہے سلام کا جواب تو ملا۔ ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ سلام کرنے کے ساتھ ساتھ آپ میں سلام کا جواب دینے کی بھی روایت نہیں۔“ مقدس اس کا طنز محسوس کیے بغیر چپ چاپ بیٹھی رہی۔

”تو آپ بھی ڈاکٹر ہیں، یقین نہیں آتا“ اس نے لائٹ براؤن کڑھائی والی آف وہائٹ چادر میں سلیقے سے کپٹی اس مختصر الوجود لڑکی کو بے یقینی سے دیکھا جو چہرے پہ چھائی سنجیدگی اور پُر وقار طریقے سے اوڑھے چادر کے باوجود بھی کم عمری ٹین ایجر ہی نظر آتی تھی۔

”تقریباً“ اس بار بھی اس کی طرف سے جواب شناور نے ہی دیا۔

”یہ زیر تعمیر ڈاکٹر ہیں۔ ایم بی بی ایس کے فائل ایئر میں ہے، کنگ ایڈورڈ کالج میں۔“ اس نے مقدس کے گھورنے کی پروا نہ کرتے ہوئے تعارف کا سلسلہ مزید آگے بڑھایا، ”اور میں شناور گل، مقدس کی فرسٹ کزن اور اکلوتی فریڈ، یہاں منی ایجنٹ ڈیپارٹمنٹ میں ہوں۔“

”بے حد خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ اس نے ہنستے ہوئے تعارف سے اگلی رسم بھی بھادی۔

”آپ لاہور میں کب تک ہیں؟“

”کچھ صحیح اندازہ نہیں کب تک رکنا پڑے، لیکن اس ایک ہفتے تک تو واپسی کا کوئی ارادہ نہیں۔“

”تو پھر یہ میری طرف سے باقاعدہ انوٹیشن ہے آرٹ گیلری میں، ہمارے پیارے دوست کی طرف سے ایگزیشن ہے پرسوں۔ ضرور آئیے گا۔“

”جی ضرور“ اس نے فوراً ہائی بھری۔ بعد میں سارے راستے ہی مقدس اس سے بحث کرتی رہی۔

”کیا ضرورت تھی اسے؟“ مقدس نے بیان کی فائل ایئر کی اسٹوڈنٹ کنگ ایڈورڈ کالج۔ منی ایجنٹ ڈیپارٹمنٹ اور تو اور فضول میں انوٹیشن بھی کیا۔ پتہ نہیں کب عقل آئے گی ہر کسی سے بلاوجہ فرینک ہو جاتی ہو۔ نجانے کون ہے، کیسا ہے۔ کیا سمجھ رہا ہوگا ہمیں۔“

”اوہو تم کیوں اس قدر بچی ہو جاتی ہو اس معاملے میں۔ آخر کسی سے ذرا سا تعارف حاصل کرنے میں کوئی ذاتیات کی حدود میں داخل نہیں ہو جاتا۔ اس نے ہماری مدد کی تھی اس بات سے تو انکار نہیں ہے ناں تمہیں، پھر کیا ہوا اگر میں نے اخلاقاً اسے انوٹیشن کر لیا آخر پرسوں کی ایگزیشن میں شامل سارے لوگ ہمارے واقف کار ہی تو نہیں ہوں گے۔ اجنبیوں کا وہاں آنا منع تو نہیں ہے اور پھر..... دو ملاقاتوں کے بعد کوئی

اجنبی نہیں رہتا۔“ شاور کو اس کی انتہا درجے کی احتیاط پسندی سے چڑھتی۔

”اور پھر وہ کون ہے، کیا ہے اس کا اندازہ تو تمہیں بھی ہو ہی گیا ہوگا۔ اس قدر پوائنٹ، کلچر اور ویل میٹرڈ شخص کم از کم میں نے تو پہلی بار دیکھا ہے۔ خواتین کا احترام کرنا جانتا ہے۔ تم نے محسوس کیا اس نے ایک بار بھی ہمیں کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ نام نہیں پوچھا۔ پتہ نہیں جانا چاہا اس سے ظاہر ہوتا کہ وہ.....“

”پلیز شانو، پلیز اسٹاپ اٹ۔“ اس نے تنگ آ کے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے۔ نہ جانے کیوں وہ اس شخص کی تعریف میں ایک لفظ مزید نہ سننا چاہتی تھی، لیکن بھلا کسی کے چاہنے سے بھی کچھ ہوا ہے۔ ایگزیشن والے روز شاور اسے کھینچ گھسیٹ کر کے اپنے ہاتھ لگے۔

”اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود اس نے مقدس کو زبردستی تیار کر لیا تھا۔“
”یہاں اکیلی بیٹھی کیا کرو گی۔ اب چٹیاں ختم ہونے پہلے آ ہی گئے ہیں، محض تمہاری ضد کے ہاتھوں مجبور ہو کے تو کسی نہ کسی طرح وقت گزارنا ہی ہے۔ وہ تو شکر ہے زارا اور احمد نے ایگزیشن کا پروگرام بنایا ہوا تھا ورنہ میں نے تو تمہاری جان نہیں چھوڑی تھی اگر مجھے بوریت کا شکار ہونا پڑتا۔“

”کوئی احسان نہیں کیا تم نے میرے ساتھ آئے۔ جس لمحہ مجھے محبت میں یہاں آئی تھی، وہ تو اب تک ادھورا ہے۔ تم سب کچھ بھلائے اپنے دوست کے کاموں میں مصروف ہو۔“ اس نے شکوہ کیا۔

”میں بھولی نہیں جان، لیکن اس طرح بار بار وہاں جانے کا کیا فائدہ؟ خیر تمہاری تسلی کے لیے کل پھر چلیں گے پتا کرنے۔“ اس نے کسی طرح بھلا چھلانگ کے اسے جانے پہ تیار کر ہی لیا۔ وہ جانتی تھی کہ مقدس اس وقت کس ذہنی کیفیت سے دوچار ہے۔ اور پوری معلومات اسے کچلے دے رہی ہیں اور جب تک وہ کسی واضح نتیجے تک نہیں پہنچ جاتی تو یہی امید و بیم کا شکار رہے گی۔ اب تو خود شاور بھی بے چینی سے اماں مومنہ کی منتظر تھی تاکہ آریا پار کوئی تو حل نکلے۔ وہ مقدس کی ممانہاں نہیں، یہ معرہ تو کھلے۔

”السلام علیکم“ اس بار شاور نے خوشنود کو دیکھ کر لپک کے سلام کرنے میں پہل کی۔
”علیکم السلام۔“ اس نے مسکراتے ہوئے شاور کے سلام کا جواب دینے کے بعد مقدس کی طرف دیکھا۔ ”کیسی ہیں آپ؟“

”جی ٹھیک ہوں۔“ اب اتنی بد اخلاق تو وہ بھی نہ تھی کہ جواب ہی نہ دیتی۔ لیکن مزید

گفتگو سے بچنے کی خطر دانستہ رخ موڑ کے پیٹنگلز دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر خوشنود کو مکمل طور پر مقدس کی طرف متوجہ دیکھ کے شاور ٹھکی اور کچھ سوچ کے غیر محسوس انداز میں دونوں کے درمیان سے نکل گئی۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنساے بڑی دلچسپی سے اس کی بے اعتنائی کے مظاہرہ دیکھنے لگا۔ اس وقت آرٹ گیلری میں موجود ایک سے ایک ماڈرن ازم کی شکار لڑکیوں کے درمیان اس کا سادہ مگر پر وقار وجود انفرادیت کے احساس سے دوچار کر رہا تھا۔ سر کو مکمل طور پر ہر وقت ڈھانپے رہنے والا آنچل، سر کو قدرے اونچا کر کے پیٹنگلز دیکھنے کی کوشش میں ذرا سا ڈھلک گیا تھا۔ سہرے بالوں کے درمیان سے نکلتی سیدھی اور شفاف مانگ میں کہیں کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ پیشانی کا نور یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس کے نام کے رشتہ داروں کی شخصیت میں کتنے گہرے ہیں۔ مصنوعی رنگوں سے قطعی بے نیاز لب و زخار نفرت کی جلد پہ لافوت کی مانند دمک رہے تھے۔

”اور آنکھوں میں ترسے ہوئے نیلم اس چہرے کو کس قدر بیش قیمت بنا رہے ہیں۔“ خوشنود نے سوچا۔

”پھر کیا ہے.....؟“ ان سنا رہے تھے جو اس انمول نگینے کو محروم ظاہر کر رہا ہے..... اداسی کی اس کہ کہ کا سبب کیا ہے جو اس کھری ہوئی شخصیت کو دھندلائے دے رہی ہے..... وہ کون سی الجھن ہے جس کے الجھاؤ نے اسے گرد و پیش سے اس قدر بیگانہ کر دیا ہے۔“ وہ اس کی کھوئی ہوئی سی کیفیت کا بار بار گونجنے میں خود بھی کہیں کھوسا گیا۔

کچھ میر کی خاموشی محسوس کر کے مقدس نے پلٹ کر دیکھنا چاہا۔ شاور غائب تھی لیکن ڈاکٹر خوشنود نے اس کے عقب میں دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہا تھا۔ اس کے یک دم ٹپکے ہوئے چہرے پر ہنسی ٹھٹھک کر ٹھہر گیا۔ ان آنکھوں میں سر اسیمبلی سی محسوس کر کے وہ کہنے لگا۔
”آپ کی کزن غالباً اپنے کلاس فیلوز کے ہمراہ ہیں۔“

مقدس کو اس لڑکی پہ بے انتہا غصہ آیا جو ضد کر کے اسے ساتھ لائی تھی اور اب اجنبی لوگوں میں تنہا چھوڑ گئی تھی۔ تنہا ہونے کی بے بسی اس کے ہر نقش سے عیاں ہونے لگی، جسے محسوس کر کے وہ پھر کہہ اٹھا۔

”آپ اپنی دوست پہ اتنا ڈپینڈ کیوں کرتی ہیں؟“
”ڈپینڈ؟ جی نہیں میں صرف اس کی عادی ہوں اور کوئی بات نہیں، ہمارا ساتھ کئی برسوں پرانا ہے اور پھر میری کسی سے کوئی خاص دوستی بھی نہیں، اس لیے اس کا میرے پاس

نہ ہونا مجھے کچھ ڈسٹرب کر جاتا ہے۔“ وہ اس کے سوال کا جواب دینے کی پابند تو نہ تھی لیکن اس کے ڈپینڈ کرنے والے الزام نے اسے جزیرہ کر دیا تھا۔

”اور یہ ڈسٹربنس تو آپ پہ مکمل طور پر چھائی ہوئی ہے۔“ وہ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی جھنجھلاہٹ دیکھ کے خاموش ہی رہا۔

☆☆☆

اسے خان افراسیاب خٹک کے گھر آئے دو روز گزر چکے تھے۔ اس کی حالت اتنی دگرگوں تھی کہ دراب کو اسے اس طرح باچا جان کے سامنے لے جاتے ہوئے خوف محسوس ہوا اسی لیے بڑے لالہ کی ہدایت کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے وہ سیدھا زیریاب کو پہنچا لے آیا تھا۔ خود افراسیاب، بھائی کا شک و جود کچھ کے ڈھکے چھپے لہجے میں دو عشروں میں انہوں نے بھائی کی ایک جھلک تک دیکھنے سے اجتناب کیا تھا۔ شروع شروع میں جب بھی کوئی زیریاب سے ملنے کی کوشش کرتا اس کی دیوانگی بڑھ جاتی۔ وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا، کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ افراسیاب کی ہر اس کوشش کو بھی اس نے سختی سے رد کر دیا، جو انہوں نے اسے بچانے کے لیے کرنا چاہی، وہ اپنے اثر و رسوخ استعمال کر کے اس کی سزا کم سے کم کروانا چاہتے تھے۔ لیکن زیریاب نے دونوں الفاظ میں کہہ دیا۔

”میں حرام موت نہیں مرنا چاہتا، لیکن مجھے اس کے لیے مجبور مت کرو۔ اس وقت جس چیز کی مجھے سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ موت ہے اور جس چیز سے میں ہر ممکن طرح بچنا چاہتا ہوں، وہ زندگی ہے۔ مجھے ان بوسیدہ دیواروں کے اندر گھسے مرنے دو۔ یہاں قید میرے وجود کے زندہ ہونے کی خبر تو کسی کو نہ ہوگی۔ خدا کے فضل سے لالہ مجھے اشتہار مت بناؤ۔۔۔۔۔ مجھے روشنی میں مت لاؤ۔۔۔۔۔ اندھیرے میں پڑا رہنے دو اور وہاں سے نہ نکلو۔ یہ دیواریں میرا بھرم رکھ لیں۔ مجھے زندگی کی طرف کھینچ کے لانے کی کوشش مت کرو۔۔۔۔۔ میری موت کی دعا کرو۔ باعزت موت کی۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔ اگر مجھے دوبارہ باہر لانے کی کوشش کی تو۔۔۔۔۔ میں اپنے آپ کو ختم کر لوں گا۔ مجھے حرام موت کی طرف بڑھنے پہ مجبور مت کرو لالہ۔“ اس کے جنون اور دیوانگی سے گھبرا کے خان افراسیاب نے اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیا، لیکن وہ اس کی موت کی دعا نہ مانگ سکے۔ بس بے چینی سے وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔۔۔۔۔

وقت جو تلخ سے تلخ زہر کو بھی بے اثر کر دیتا ہے۔ وقت جو بھیا نک سے بھیا نک تر عکس پہ بھی گرد کی تہ جمادیتا ہے۔

وقت جو گہرے سے گہرے گھاؤ کو بھی بھرتا نہیں تو کھرند تو ضرور لے آتا ہے۔ اور شاید زیریاب کے زخموں پہ بھی کھرند آچکے تھے۔ ان سے خون تو اب بھی رستا تھا، لیکن اس طرح بہتا نہیں تھا۔ اس کی ویران آنکھوں میں دیوانگی اب بھی ٹکریں مارتی دکھائی دیتی تھی لیکن وہ شدتیں ناپید تھیں جو اسے دیواروں سے سر ٹکرانے پہ مجبور کرتی تھیں۔ اس کے لب سسکیاں دبا دبا کے صحرانہ ہو چکے تھے۔ آہیں بھر بھر کے اس کی سانس کے رستے زخمی ہو چکے تھے۔ لیکن چیخیں گونگی ہو گئی تھیں، دہائیں گنگ رہ گئی تھیں اور۔۔۔۔۔ موت کی خواہش خود ہی مزید بڑھ گئی تھی۔

افراسیاب نے اپنے ہاں جانے کو بانہوں میں بھینچ لیا۔ اپنے خون کی حرارت نے زیریاب کی زندگی کے کچھ آثار پیدا کیے۔ اس کے حواس بحال ہوئے تو سب سے پہلے اسے یہ خیال آیا۔

”مجھے یہاں کیوں لائے ہو دراب؟ وہ باچا جان۔۔۔۔۔ بی بی جان؟“ اسے اندیشہ سا گزرا۔۔۔۔۔ ”آہ۔۔۔۔۔ اپنی ذات کے ساتھ الجھتے ہی اتنے برس گزار دیے، ان ہستیوں کا کوئی خیال تک نہ آیا جو اس ذات سے وابستہ ہیں۔“ اسے ندامت نے آن

خیر۔۔۔۔۔ ”باچا جان اور بی بی جان۔ کیا وہ تمہیں اس حال میں دیکھ پائیں گے زیریاب، میں سالوں کا سیر ہو چکا ہوں۔“

اس نے اپنے سامنے بیٹھے افراسیاب لالہ کو نظر بھر کے دیکھا جن کا کبھی وہ باچا جان کے بعد سب سے زیادہ احترام کیا کرتا تھا اور ان سے ڈرتا تو وہ شاید باچا جان سے بڑھ کے تھا۔ آج بھی ان کی شخصیت کے رعب کا وہی عالم تھا۔ بلکہ ہلکے بھورے بالوں میں جھمکتے چاندی کے تاروں نے اور بھی دبدبہ قائم کر دیا تھا۔ سنجیدہ تاثر دیتی آنکھیں، کناروں پہ پھیلی لکیروں کے ساتھ اور بھی سنجیدہ نظر آرہی تھیں۔

زیریاب نے نظر اٹھا کے ذرا فاصلے پہ کھڑے دراب کو دیکھا۔ اس کا جسم پہلے کے مقابلے میں بھر چکا تھا۔ نوکدار مونچھیں تو اس کی پہلے سے تھیں اب داڑھی کا اضافہ بھی ہو چکا تھا۔ البتہ سر کے بال خاصے جھڑ چکے تھے، جن کی وجہ سے ماتھا اور کھلا کھلا لگ رہا تھا۔

رنگت پہلے کی بہ نسبت سنو لالچکی تھی۔

”شاید شکار کا شوق عروج پہ ہے۔“

زریاب نے اس کے کھر درے ہاتھوں اور سانولے ہوتے چہرے کو دیکھ کے اندازہ لگایا۔ دراب ایک بار پھر کرسی پہ بیٹھ گیا تو وہ مسکرایا۔ پچھلے دس منٹوں میں وہ چار بار اٹھ اور بیٹھ چکا تھا۔

”تو خان دراب خٹک اتنی تبدیلیوں کے بعد بھی ایک چیز ہے جواب تک ویسی کی ویسی ہے۔ تمہاری طبیعت کا بے صبر اپن اور بے چینی۔“

”کیا سوچ رہے ہو لالہ؟“ اس نے سوال کیا تو زریاب دونوں کے چہرے باری باری دیکھتا ہوا کہنے لگا۔

”آپ دونوں بھی تو کتنے بدل گئے ہیں۔ اتنے بڑے بڑے ملک رہے ہیں۔“

”صرف بڑے.....“ افراسیاب نے اسے احسان سے دلا دیا۔

”کبھی غور سے خود کو دیکھا ہے زریاب تم بوڑھے لگے ہو۔“ زریاب نے بھائی کے ہاتھوں کی مضبوط اور محفوظ گرفت سے اپنا استخوانی ہاتھ نکال دیا۔ لمبی لمبی انگلیوں پہ زرد کھال منڈھی تھی اور فراخ اٹھیلی مشقت کے تمام وقت سجائے ہوئے تھی۔ اس نے اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیر کے یہ سچ محسوس کرنا چاہا وہاں بھریاں ہی بھریاں تھیں۔

سلوٹیں ہیں میرے چہرے پہ حیرت کیسی
زندگی نے مجھے تم سے زیادہ سب سے

☆☆☆

خوشبو ہے، دھنک ہے چاندنی ہے
وہ اچھے دنوں کی شاعری ہے
بھیکے ہوئے پھول حرف اس کے
وہ رم جھم کی زہاں میں بولتی ہے
ہاتوں میں تھکن ہے شام جیسی
لجھ میں سحر کی تازگی ہے
چہرے پہ حیا کا روپ جیسے
دریا میں شفق گھل گئی ہے

برسا ہے شمار چاندنی کا یا
اس کی جبین دمک اٹھی ہے
کیا جانے وہ کیسے مسکرائی
چہرے سے کرن چھن پڑی ہے
چہرے پہ بکھر کے زلف اس کی
سورج سے خراج مانگتی ہے
پل بھر کو سرک گیا جو آنچل
کلیوں کی طرح سٹ گئی ہے
اے مشتریاں حسن عالم!
خوشنود نے ”طلوع اشراق“ زندگی اور سینے پہ دھر کے یونہی نیم دراز سوچنے لگا، خوشبو

ہے، دھنک ہے، چاندنی ہے۔
خوشبو، دھنک اور چاندنی کا امتزاج بھی بھلا کہیں ہوا ہے..... ہزار ہا یہ بات اس کے ذہن میں آئی تھی اس غزل کو پڑھ کر اور ہر بار ہی وہ سر جھٹک کے مسکرا دیا تھا۔ لیکن اب کون سی بات ہے جسے وہ جھٹکا کرتا ہے۔ کیا اس کے مسکرانے سے کرنیں نہیں چھن پڑی تھیں؟

کیا اس کے لہجے میں سحر کی سی تازگی نہیں ہے؟ کیا اس کی جبین چاندنی میں نہائی ہوئی نہیں گئی؟

اور کیا وہ..... دونوں جہاں سے قیمتی نہیں لگتی؟
اور یہ آخری سوال وہ خود سے کر کے چوٹک گیا تھا۔

”کچھ تو اس میں ہے خوشنود جس نے تمہیں اتنا بے خود کر دیا ہے ورنہ جن حالات میں تم یہاں آئے ہو ان کی گنجی کیا اس بات کی اجازت دیتی تھی کہ تم سب کچھ فراموش کیے آرٹ گیلری میں ایک مشکل سی الجھی ہوئی سی لڑکی کے پیچھے خوار ہوتے رہے؟“
اس کے دل نے اسے مزید کریدا تو وہ چپکے سے اقرار کر گیا۔

”ہاں..... کچھ نہیں بہت کچھ ایسا ہے جو مجھے اس کی جانب کھینچتا ہے۔ جو مجھے وقتی طور پر ہی سہی مگر بھلا دیتا ہے کہ میں یہاں کس لیے آیا ہوں۔ کاش کہ وہ بھی یہ جان لے کہ

وہ کسی کے لیے کتنی ضروری بن گئی ہے۔“ اس نے خدا سے دعا کی، کوئی معجزہ ہی ہوتا جو اسے مقدس کے آگے اظہار کی طاقت دے پاتا، ورنہ اس کی حد درجہ بے نیازی اور لاتعلیق سارویہ خوشنود کی ہمتیں پست کر دیتا تھا۔

پرواہ ہی نہیں اسے کسی کی
اپنے سے وہ کتنی اجنبی ہے
وہ غنچہ وہن سکوت زادی
کھلنے پہ بھی کم ہی بولتی ہے

☆☆☆

”تمہیں کیا میری بات کا بالکل بھی اعتبار نہیں رہا جو خود چلی آئی ہو۔“ خدا والا نے اپنے انتظار میں ٹھہلا دیکھ کے جل ہی تو گئی۔
”پھر کیا کروں میں؟“ وہ بے بسی سے بولی۔
”تین دن سے تم یہی کہہ رہی ہو کچھ پتا نہیں چلا، کوئی خبر نہیں لی۔ آخر کب تک میں

.....“
”وہ اماں برکتے تو اب میری صورت دیکھ کے بھڑک جاتی ہے۔ ویسے جس انداز میں وہ جھنجھلاتی ہے میرے سوال پر۔ اس سے مجھے تمہارا شک کچھ یقین میں بدلتا نظر آتا ہے کہ واقعی وہ جانتے بوجھتے انجان بننے کی کوشش کر رہی ہے۔ صبح بھی مجھے دیکھتے ہی لوح بدل کے دوسری جانب چل پڑی۔ صاف لگ رہا تھا مجھ سے چھپنے کی کوشش کر رہی ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ کسی کام سے ہاسٹل سے باہر چلی گئی ہے۔“

”اوہ، تو تمہیں پیچھا کرنا چاہیے تھاناں اس کا۔“ وہ اس کے ساتھ سے اٹھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
”پیچھا کرنا چاہیے تھا، پاگل ہوئی ہو کیا، اب میں مائیوں کا پیچھا کرتی پھروں۔“ وہ گہڑ کے بولی۔

”تم سے کچھ نہیں ہوگا۔ اسی لیے میں خود آئی ہوں آج۔ کاش کچھ دیر پہلے آ جاتی تو..... مجھے یقین ہے وہ اماں ہم سے کچھ چھپا رہی ہے۔ لیکن میں بھی اس سے ضرور اگلاؤں کے رہوں گی۔ بس ایک بار مجھے پتا چل جائے کہ کیا واقعی وہ..... میری ماماں یا نہیں۔“
”اچھا یہ بتاؤ کچھ کھاؤ پیو گی یا یہی باتیں کرنے آئی ہو؟“ شناور نے اس کا دھیان

بٹانا چاہا۔

”میرے پاس فی الحال اس موضوع کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ سچ پوچھو تو میں اس بار لاہور بھی صرف اس لیے آئی تھی شانودرنہ جس ذہنی کیفیت سے میں گزر رہی ہوں اس میں کالج جانا محض وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوتا۔ لیکن مجھے خدشہ ہے کہیں میرا یہاں آنا اک کارزیاں نہ ثابت ہو۔“

”اُف خدایا! کس قدر مشکل الفاظ بولنے لگی ہو تم۔ غالباً تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ اگر وہ خاتون تمہیں نہ ملیں تو تمہارا لاہور آنا بے کار جائے گا، ہے ناں۔“ وہ تصدیق کے لیے رکی۔

”تو مائی ڈیئر کزن یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی بہتری ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس بار کے تمہارے لاہور کے سفر نے تمہاری تقدیر میں کچھ اور لکھ دیا ہو۔“

”مثلاً.....“ وہ رُک کے سوچنے لگی کہ کہے یا نہ کہے حالانکہ یہ بھی غیر معمولی بات تھی کہ شناور اور کچھ کہنے سے قبل سوچنے کی زحمت کرے۔ پھر اپنی ازلی بے دھڑک انداز میں کہہ اٹھی۔

”مثلاً ڈاکٹر خوشنود۔ نہ تم لاہور آنے کا اتنا اچانک فیصلہ کرتیں، نہ ہم بائی روڈ سفر کی مصیبت مول لیتے اور نہ ہی وہ..... مانوس اجنبی ٹکراتا۔“
”واٹ دیش؟ تمہیں پتا ہے تم کیا بک رہی ہو؟“ حسب توقع مقدس کی گلابی رنگت

.....
”سب پتا ہے۔“ وہ اس کے بلند لہجے کے رعب میں قطعی نہ آئی۔
”اور تم جانتی ہو کہ تمہاری ہر بات کا پتا پہلے مجھے چلتا ہے بعد میں تمہیں۔ بلکہ جب تک میں تمہیں نہ بتاؤں تمہیں تو یہ بھی خبر نہ ہو کہ تم سوچ کیا رہی ہو اور چاہتی کیا ہو۔“
”تو تم بھی یہ سمجھتی ہو کہ میں تم پہ ڈپینڈ کرتی ہوں۔“ اس کے اس قدر درست اندازہ لگانے پہ مقدس تھلا گئی۔

”میں بھی.....؟“ شناور ”بھی“ پہ زور ڈالتے ہوئے بولی۔
”تو گویا کوئی اور بھی ہے جو اس راز سے واقف ہے۔“
”فضول باتیں مت کرو۔ بات کوئی ہو رہی ہو تمہیں ضرور سچ میں اپنی بے ہودہ

ریسرچ پیش کرنی ہوتی ہے۔“

”تم چاہے اسے بے ہودہ کہو یا فضول۔ لیکن دیکھ لینا میری اس ریسرچ کا رزلٹ سو فیصد درست نکلے گا۔ ڈاکٹر خوشنود کا بار بار تم سے ٹکرانا بے مقصد نہیں ہے۔“

”مت بھولو کہ ہر بار میرے ساتھ تم بھی ہوتی ہو۔“ اس نے باور کرایا۔

”میں تو نہیں بھولی، لیکن کیا کروں ڈاکٹر صاحب کو بھی یاد نہیں رہتا کہ تمہارے ساتھ، میں بھی ہوتی ہوں۔ بلکہ وہ تو تمہیں دیکھ کے شاید خود کو بھی فراموش کر دیتے ہیں۔“

”تم یہاں بیٹھ کے اس خود ساختہ فلمی کہانی میں رنگ بھر دو اور چسکے لے لے کے سوچو جو بھی سوچنا ہے۔ کم از کم میرے سامنے یہ بات اب مت کہنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ سمجھیں۔“ وہ بیک کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہوئی۔

”ارے..... ارے رکو تو.....“ اور وہ رک گئی۔ شنوار کی آواز پہ نہیں بارگاہ میں کھڑی سلور گرے کروڑا سے اتنی املاں بڑھکتے کو دیکھ کے ڈاکٹر خوشنود نے پتہ لگا دیا کہ وہ کونسی نہیں، خوشنود تھا۔ اگرچہ اس کا چہرہ واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا پھر بھی اس کا دراز

قد، اور غیر معمولی چوڑے شانے اسی کا شاہدہ دلدارے تھے۔ باہر کی طرف نکلتی مقدس نیم وا بڑے سے گیٹ کی اوٹ میں ہو گئی۔ اماں کا رے لٹکنے کے بعد بھی ہنوز پچھلی سیٹوں سے

کچھ سامان نکالنے میں مصروف تھی۔ آخر کار وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کے باہر نکلا۔ ڈاکٹر گرے ٹوپیں سوٹ کے ساتھ بلیک شرٹ اور بلیک ٹائی میں گلاسٹون میں وہ واقعی خوشنود

تھا۔ اس نے جھک کے اماں کو سامان اٹھانے میں مدد دی دو شاپنگ بیگز میں زیناند سوٹ تھے جو شاید استعمال شدہ لگ رہے تھے۔ باسکٹ میں تھرماس اور چند برتن، ایک شیشی

کے ڈبے کے ساتھ رکھے تھے۔ چند قدم آگے چلنے کے بعد اماں اپنا کپڑا لٹکا کر اپنے کمرے کے ڈبے کے ساتھ رکھے تھے۔ چند قدم آگے چلنے کے بعد اماں اپنا کپڑا لٹکا کر اپنے کمرے کے ڈبے کے ساتھ رکھے تھے۔

آگیا ہو، پھر اپنی عادت کے مطابق بلند آواز میں پوچھنے لگی۔

”میں کہتا ہوں، اے اس کچھ کھانا پینا تے نہیں، کہ میں سویرے بخنی تے دلیہ بنالیا والے؟“ (میں نے کہا بیٹا، ابھی اس نے کچھ کھانا پینا تو نہیں؟ یا پھر میں صبح بخنی اور دلیہ بنالیاؤں) نجانے خوشنود نے کیا جواب دیا تھا۔ مقدس اماں کو گیٹ کی طرف بڑھتے دیکھ

کے پیچھے ہو جانے کی وجہ سے صحیح طرح سن نہیں پائی۔

”کون سے ہاسپٹل سے آرہی ہیں آپ اماں؟“

مقدس نے اچانک سامنے آکر اماں بڑھتے کو گڑبڑا کے رکھ دیا۔

”کدوں؟ میں کدوں گئی کتھے؟“ (کب میں کب کہیں گئی ہوں؟) وہ آئیں بائیں

شائیں کرنے لگیں۔

”آپ مجھ سے کیوں چھپا رہی ہیں۔ کیوں نہیں مجھے بتا دیتیں ان کے بارے میں۔“ وہ قدرے بلند آواز میں بولی۔ شنوار بھی قریب چلی آئی۔

”اور اماں، یہ شخص کون تھا، تمہارا کیا لگتا ہے؟ کہاں گئی تھیں تم اس کے ساتھ۔؟“ اس نے بھی اماں بڑھتے کو گھیر لیا تو وہ ہتھ سے ہی کھڑ گئی۔ اچانک مقدس کے حملے نے

اسے چونکا ضرور دیا تھا، لیکن ذرا سنبھلنے کے بعد وہ پھر اپنی جون میں آ گئی۔

”پراں ہٹو کر یو، تھانے دارنیوں، کتھوں آکھیاں میں میرے نال پچھ پریت کرن والیاں، تمہاری نہیں کسی کے نہیں، ماما لگد ایے او بندہ تھا ڈاتے نانی لگنی آں میں جیہڑی

تھانوں تسلی کراواں۔“ (برے ہٹو کر کیوں، تھانے دارنیوں، کہاں سے آ گئی ہیں، مجھ سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے۔ کسی نے تمیز نہیں سکھائی تمہیں۔ وہ تمہارا نانا لگتا ہے یا میں تمہاری نانی لگتی ہوں جو تمہارے سوالوں کے جواب دوں) وہ بری طرح جھڑکتی آگے چل پڑی۔

”لو کروالی عزت افزائی۔“ شنوار نے اسے جتایا۔

”ویسے یار، واقعی سوچنے والی بات ہے ڈاکٹر خوشنود کا اس مائی سے کیا تعلق؟ تمہارے پاس تو کارڈ بھی تھا ناں ان کا۔ اس بھڑکیلی اماں سے سر پھوڑنے کے بجائے تم

انہی سے پوچھ لو۔ شاید کوئی سراہا تھ لگ جائے۔ نہ بھی ہو تو کم از کم تمہاری تسلی تو ہو جائے گی۔ ہوسکتا ہے وہ محض انسانی ہمدردی کی بنا پہ اسے لفٹ دے بیٹھے ہوں یا اس کی کسی

عجز کا مثبت علاج حاصل کر رہے ہوں۔“ شنوار کی عادت تھی وہ ہمیشہ مسئلہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے کئی ایک حل بھی بتا دیتی تھی۔ یا یوں کہیے کہ کسی بھی بات کے مثبت و

منفی پہلو دونوں ہی سامنے رکھ دیتی تھی۔

”ڈاکٹر خوشنود علی وردگ۔“

کارڈ پہ لکھے نام پہ سرسری سی نگاہ ڈال کے وہ نیچے درج فون نمبرز کی جانب متوجہ ہونا چاہتی تھی لیکن خوشنود کے نام کے آگے لگے حوالے نے اسے منجمد کر دیا۔ خوشنود کا ”وردگ“ ہونا پڑ اسرار خاتون کا مومنہ ہونا، ثابت کر رہا تھا۔

”آپ.....“ اسے گمان سا گزرا لیکن اپنی خوش بختی کا اتنا یقین نہیں تھا کہ وہ پورے وثوق سے اس کا نام لے سکتا۔

”السلام علیکم“ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ اپنا تعارف کیسے کرائے۔
 ”وعلیکم السلام، مقدس؟“ اس نے آس و امید سے چور چور لہجے میں پوچھا۔
 ”جی.....“ اسے اپنے ہونے پہ شرمندگی تھی یا پھر شاید فون پہ ہونے کی۔
 ”زہے نصیب، کیسے کیسے یاد کیا؟“

”مجھے آپ سے ایک کام تھا۔“ وہ براہ راست اپنے مدعا پر آ گئی۔
 ”میری خوش نصیبی کہ اب آپ کو بھی مجھ سے کام پڑنے لگے۔“ اس کا چہکنا مقدس کو ایک آنکھ نہیں بھارہا تھا، اس نے چڑ کے موبائل آف کر دیا۔ خوشنود کے مسلسل مسکراتے لب یکدم سکڑ گئے۔
 ”تف ہے تم پہ ڈاکٹر وردگ، ایک لڑکی کا فون کیا آ گیا۔“ انہیں جیسے میر کے ڈائلاگ جھاڑنے لگے، یہ احساس کیے بغیر کہ مخاطب ایک مقدس ہستی ہے۔“ اس نے اپنے اندر گنگنا تے جذبے کو ڈپٹا اور پھر سے اپنی سویر و سنجیدہ جون میں آتے ہوئے سی ایل آئی پہ نمبر چیک کیا۔

”ہیلو“ زندگی سے بھرپور آواز شناور کی تھی۔
 ”مس شناور میں ڈاکٹر خوشنود بول رہا ہوں۔ ابھی چند منٹ قبل اس نمبر سے مس مقدس نے مجھے کال کی تھی۔“

”جی جی..... وہ بس..... اچھا آپ بات کیجئے۔“ اس نے زبردستی مقدس کے کان سے موبائل لگایا۔ شناور کی بے موقع مسکراہٹیں اسے زہر لگ گئیں۔
 ”جی مس مقدس، کہیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ دوسری طرف سے آتی سنجیدہ آواز نے اسے دوبارہ بولنے پہ آمادہ کیا۔

”میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی ڈاکٹر خوشنود کہ اماں برکتے..... شناور کے ہاسٹل کی ملازمہ کے ساتھ آپ کون سے ہاسٹل گئے تھے؟“ بغیر کسی تمہید کے اس نے سوال کر دیا۔
 ”جی.....؟“ حیران تو وہ پہلے ہی تھا کہ ریزروسی رہنے والی اس محتاط مزاج کی لڑکی کو اس سے کیا کام ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے لہجے میں موجود استعجاب یہ ظاہر کر رہا تھا کہ مقدس کا یہ اچانک سوال اس کے گمان سے بھی باہر تھا۔ اس کو سننے میں چند سیکنڈ لگے لیکن وہ

دوسرے سوال سے خود کو روک نہ پائی۔

”اگر میرا سوال بہت زیادہ ذاتی نہ ہو تو کیا میں یہ جان سکتی ہوں کہ اماں برکتے کے ساتھ رہنے والی خاتون سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟“ اس کے ہنستے ہوئے لہجے پہ وہ مزید ٹھٹھکا۔

”یہ سوال تو میں بھی کر سکتا ہوں، لیکن چونکہ آپ نے پہلے پوچھا ہے تو میں بتا دوں کہ میں شیخ زائد ہسپتال میں اپنے ایک دوست ڈاکٹر محمود غوری سے ملنے گیا تھا، وہاں ایک مریضہ کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ میرے علاقے کی ہیں اور ہم لوگ اپنے علاقے کی رعایا کا خیال رکھتے ہیں، یہ ہمارے بزرگوں کی روایات ہیں۔ محض انسانی ہمدردی اور کچھ اپنی ذات قبیلے کی ہونے کی وجہ سے، میں نے ڈاکٹر محمود سے ان کے علاج معالجے کی خصوصی درخواست کی اور ان اماں جی کو بھی صرف اخلاقاً ہی ہاسٹل تک لفٹ دے دی تھی۔ اب آپ یہ بتائیے کہ آپ کو اصل اعتراض کس بات پر ہے، ان اماں جی کو لفٹ دینے پہ یا ان اماں جی پہ توجہ دینے پہ۔“

وہ شاید اس تو جیہہ کو مان ہی لیتی اگر خوشنود کا وردگ ہوتا اس پہ کھل نہ گیا ہوتا۔ اس لیے قصداً اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ وہ شیخ زائد ہاسٹل میں کس وارڈ میں مل سکیں گی۔“
 ”میں اس کے بے تاب لہجے میں جھلکتی استعجاب ڈاکٹر خوشنود کے کھٹکے ہوئے دل کو پھر سے چونکا۔ اس نے کچھ سوچ کے کہا۔“

”اگر آپ مجھے آگے وقت بتا دیں میں آپ کو لے چلا ہوں ان کے پاس۔“
 ”نہیں..... میں آج دس بجے ہاسٹل پہنچ جاؤں گی۔ آپ بس مجھے ان سے ملوادیتے۔“ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے لائن ڈس کنکٹ کی، دوسری جانب ریسپور ہاتھ میں لیے ڈاکٹر خوشنود کے چہرے پہ تعجب اور الجھن کے اثرات نمایاں تھے۔

☆☆☆

”زریاب.....!“

آج فجر سے سے ہی بی بی جان کے دل کو جیسے پٹنگے لگے ہوئے تھے، کبھی ادھر کبھی ادھر۔ اک عجیب سی بے چینی نے گھیر رکھا تھا۔ ظہر کی نماز ادا کر کے وہ آج اوپر اپنے کمرے میں آرام کرنے چلی گئی تھیں، ورنہ ہمیشہ ہی وہ مغرب کے بعد اپنے کمرے کا رخ

کرتیں۔ ان کا ٹھکانا دن بھر لاؤنج میں بچھا وہ جہازی سائز تخت ہوتا جہاں سے وہ با آسانی دن میں کئی کئی بار اٹھ کے باچا جان کے کمرے تک ہو آتیں۔ لیکن آج تو انہوں نے اپنے خان جی کے کمرے میں بس صبح ایک ہی بار جھانکا تھا۔ بستر پر بے حس و حرکت پڑے لائے مگر نجیف سے وجود کی گدلی آنکھیں چھپت پھلے چکے پھلے جی تھیں۔

”خان جی!“ انہوں نے آواز دی۔

”زریاب!“ تھکی تھکی سانسوں پر ڈولتا یہ نام ان بوڑھے لبوں سے آزاد ہوا اور منتظر بے بس آنکھیں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ بی بی جان کو دھچکا سا لگا اور پہلی بار..... پہلی بار وہ خان ارباب خٹک کو کوئی دلا سے دیئے بغیر، کوئی خوش آئند خبر سنائے بغیر واپس لوٹ گئیں۔ آج تو انہیں خود کسی تسلی بھرے ہاتھ کی ضرورت تھی، مچلتے تڑپتے پہلو پہلے تھے یہ سر رکھا ہی تھا کہ پیچھے مردان خانے سے کچھ شور سنائی دیا۔ عموماً افسانہ کے آنے پر اس طرح بھٹکڑ مچا کرتی تھی اس کی سرکاری گاڑی کے ساتھ گاڑی اور کن مین کا ایک ریلہ بھی تو ہوتا تھا انہوں نے لینے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اٹھ کے کھڑے ہو گئیں۔ ابھی اپنی بڑی سی چادر پھیلا کے شانوں پر ڈال ہی رہی تھیں کہ دروازہ ایک کھٹکے سے کھلا ان کی پرانی ملازمہ وگمہ جو اس باختہ سی پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ اچھڑا آئی۔ بی بی جان نے اس کی جسارت کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا۔

”وے جئے؟“ (کیا ہے لڑکی؟)

”زریاب لالہ رانگلے۔“ (زریاب صاحب آگئے۔)

”وے؟“ (کیا؟) وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”سوخ زریاب؟“ (کیا زریاب؟)

”خاہ جی“ (ہاں جی)

انہیں کچھ پتا نہ چلا کب وہ کمرے سے نکلیں کب بیڑھیاں اتریں اور کب وہ اس روبرو تھیں۔

”زریاب.....!“

انہوں نے سامنے کھڑے شکستہ وجود والے ہارے ہوئے انسان میں وہ شیرازیوں کی سی چھب ڈھونڈنا چاہی۔ ان چمکتی آنکھوں میں ہر دم ہلکورے لیتا وہ معصومیت بھرا تجسس تلاشنا چاہا وہاں فقط ٹوٹے ہوئے آئینے کی کرجیاں تھیں۔ وہ متذبذب سے کھڑی رہ گئیں دل کسی طرح ماننے کو تیار نہ تھا یہ وہی خان زریاب خٹک ہے جسے وہ آنکھ بھر کے دیکھتے بھی

گھبراتی تھیں۔ مبادا اپنی ہی نظر لگ جائے۔ زریاب اپنا کرجی کرچی وجود خود ہی سمیٹ کے بی بی جان کے گلے لگ گیا۔ ان کے بازوؤں نے بڑھ کر اسے سمیٹا۔ ممتا کے گرم جوش سینے سے لگ کے برسوں سے ٹھنڈا پڑتا خون پھر سے ابل پڑا۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اپنے ہی آنسو اس کے لیے اجنبی اجنبی سے تھے۔ وہ تو کب سے نہیں رویا تھا، کب سے نہیں ہنسا تھا۔ بلکہ اس نے تو بہت عرصہ پہلے ہی وہ سب کرنا چھوڑ دیا تھا جس سے اس کے زندہ ہونے کا احساس ہوتا۔ حضرت بی بی نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھاما اور کپکپاتے لہجے میں کہا۔

”میں صبح سے سوچ رہی تھی کہ خان جی کا سامنا کیسے کروں۔ ان کی آنکھوں کے سوال اب مجھ سے نالے نہیں جاتے تھے۔ اللہ نے مجھ پر کرم کر دیا اب میں خان جی کے پاس جاؤں گی، ان کا زریاب لے کر۔“

☆☆☆

طویل کوریڈور سے گزرتے ہوئے خوشنود اور مقدس دونوں ہی متضاد کیفیات کا شکار تھے۔ خود سے دو قدم کے فاصلے پر وجود مقدس کا سمنا سمنا وجود خوشنود کو اک خواب سا لگ رہا تھا، اس کے ذہن میں بہت سے سوال کلبلارہے تھے، لیکن ان مبہم سوالوں کو زبان دے کر وہ اس خواب سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ خواب اسے کہاں تک لے کے جاتے ہیں۔ اسلام آباد سے لاہور روانہ ہونے سے ایک روز قبل ہی اس خط کا ملنا شاید اس خواب کی تمہید تھی۔

لاہور پہنچنے کے بعد ہی اس اتفاقہ ملاقات نے اسے پہلی بار اک خواب دیکھنے پر اکسایا۔

ابھی تو اس نے دل کی باتوں میں نہ آتے ہوئے خواب دیکھنے سے ہر ممکن احتراز کیا تھا کہ چند اور حادثاتی ملاقاتیں آنکھوں کو خوابوں کا ذائقہ زبردستی سونپ گئیں۔

اس کو خود سے ہمکلام ہوتے دیکھنے کا خواب.....

اس کے ہمراہ قدم بہ قدم چلنے کا خواب.....

اور..... اور وہ دیکھنا چاہتا تھا یہ خواب اسے کہاں تک لے کے جاتے ہیں۔

مقدس کا ہر اٹھتا قدم اس کے دل کو مٹھی میں جکڑ لیتا تھا۔ آج وہ ایک ایسی ہستی کو دیکھنے جا رہی تھی جو شاید کسی بھی انسان کی دنیا میں سب سے قریبی اور عزیز ترین ہستی ہوتی

آج سے کچھ دن پہلے اس نے بھولے بھٹکے بھی بھی یہ تصور نہیں کیا تھا کہ وہ بھی اس ہستی سے مل پائے گی۔۔۔۔۔ اس ہستی کا اس دنیا میں وجود ہے بھی یا نہیں۔ اور پچھلے کچھ دنوں سے وہ اٹھتے بیٹھتے، جاگتے سوتے، اسی ایک ہستی کو سوچ رہی تھی، اس کے پیکر کو تصور میں تراش رہی تھی اور آج۔۔۔۔۔ آج۔۔۔۔۔ محض چند قدم کے فاصلے پہ۔۔۔۔۔ چند ساعتوں کے بعد وہ اس کے روبرو ہوگی۔ خوشنود کے تھمتے قدموں نے اسے بھی رُک جانے پر مجبور کیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اور پھر اس کے اشارے پہ آئی سی یو کی گلاس وال کے آگے کھڑی ہو گئی۔

ایک۔۔۔۔۔ دو۔۔۔۔۔ تین اور نمبر تین بیڈ پہ اس کی متلاشی نظریں جم گئیں۔ آکسیجن ماسک سے ڈھکا وہ چہرہ صرف ایک ہی رخ سے نظر آ رہا تھا لیکن مقدس کو اس چہرے سے آشنائی حاصل کرنے کے لیے ایک ہی نقش کافی تھا۔ وہ پیشے سے چپکے ہوئی چند قدم آگے سر کی لیکن وہاں سے یہ ادھورا عکس بھی نظر آتا بند ہو گیا وہ پلٹ کے پھر سے اپنی جگہ پہ آئی۔ خوشنود حیرت زدہ سا اس کی بے تابیاں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنا کارڈ دکھا کے ڈیوٹی پہ موجود نرس سے اجازت طلب کی اور اسے اندر لے آیا وہ کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے چلتی بیڈ نمبر تین کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

کھڑی مغرور ناک اور گداز کٹاؤ دار لبوں والے چہرے پر علم نے اتنے اثرات نمایاں نہیں کیے تھے جتنے کہ بیماریوں نے، یہ اس چہرے کی جھریوں سے پاک شفاف جلد سے ظاہر ہو رہا تھا۔ لیکن نیلے پڑتے ہونٹ، آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے اور ہاتھوں پیروں کا لاغر پن اس بات کا گواہ تھا کہ دل کا یہ شدید دورہ پہلا حملہ نہیں تھا اور ایک طرف کا رُخسار۔۔۔۔۔ جلے ہوئے نشانات لیے نجانے کن کہانیوں کو چھپاتے ہوئے تھا۔ اس کے ہولے سے اس چہرے کو چھونا چاہا۔ ان سیاہ پڑتے تھکے ماندے لرزتے پوٹوں کے نیچے کیا اب بھی شہد کی مچھلیں آباد ہیں۔ اس کی آنکھیں برس پڑیں۔

”مما۔۔۔۔۔!“

اور۔۔۔۔۔ خوشنود علی وردگ کا خواب ٹوٹ گیا۔

اپنے خیالوں میں گم کھڑی مقدس خوشنود کے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھ سکی، نہ جھجک کے دو قدم پیچھے ہٹنا محسوس کر سکی۔ اس کی تمام تر حیات تو سامنے موجود مومنہ علی کی طرف

متوجہ تھیں اپنے پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھر کے واپس جاتے ڈاکٹر خوشنود کی طرف تو اس کا دھیان ہی نہ گیا۔

☆☆☆

”سب کچھ کتنا واضح تھا، بالکل صاف۔۔۔۔۔ نجانے مجھے سمجھنے میں وقت کیوں لگا۔ اتنا وقت۔۔۔۔۔ اتنے وقت میں تو اب۔۔۔۔۔ اب کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا۔“ پی سی میں بک اپنے کمرے میں آ کے خوشنود نے نئے سرے سے اس سارے قصے کو سمجھنا چاہا۔

”تو وہ ان کی بیٹی ہے، یعنی صرف ان کی نہیں بلکہ خان ذریاب خٹک کی۔

کیا ضرور اسے ہی خٹک خاندان کی بیٹی ہونا تھا؟

اور کیا یہ بھی ضروری تھا کہ اس شخص کا حوالہ اس کے ساتھ ہوتا؟

اور ضروری تو یہ بھی نہیں تھا کہ ساری دنیا چھوڑ کے تمہارا دل ایک اسی لڑکی پہ آتا ہو کہ خوشنود علی وردگ۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔

تقدیر اپنے فیصلے، سارے نفع نقصان ذہن میں رکھ کے نہیں کرتی۔ اسے پیچیدگیاں پیدا کرنے کا شوق ہے۔ اچھی بھلی سیدھی سادی چلتی کہانی میں نیا موڑ لانا تو قسمت کی پرانی عادت ہے۔“ وہ بے بسی سے آنکھوں پہ بازو رکھ کے اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ اس کے سوا اب اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ خون کا معاملہ تھا۔۔۔۔۔ خون کا رنگ بدلنا جانتا ہے نہ تاثیر۔

مقدس کی رگوں میں دوڑنے والا خون اس شخص کا تھا جس کے ہاتھوں میں فیروز علی وردگ کا خون مل گیا تھا۔ اور فیروز علی وردگ کا خون خود خوشنود علی وردگ کے جسم میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

خون کی یہ تاثیر تھی کہ جس کے خوف سے اس کی ماں لائی بی بی نے اسے اپنی آنکھوں سے دور کر لینا گوارا کر لیا۔ وہ ڈرتی تھیں کہ سید و شریف کی فضاؤں میں موجود فیروز کی جوان اور المناک موت کے نوے کہیں کچے ذہن کے خوشنود کو اس راہ پہ نہ چلا دیں جس پہ چلنا پختون اپنی شان تصور کرتے ہیں ایسے میں وہ خود کو صرف ایک غیرت مند پختون کی حیثیت سے منوانا چاہتے ہیں، بھول جاتے ہیں کہ وہ کسی کا سہاگ بھی ہیں، کسی کی گود کا پھول بھی ہیں، کسی بہن کی تمام تر امیدوں کا مرکز بھی ہیں۔

فقط ایک فاتحہ اور ذرا سی زمین کی

طلب گار۔

مومنہ

اس نام سے تو وہ بخوبی واقف تھا اور اس نام کے ساتھ ایک اور نام بھی تازہ ہو جاتا تھا، خان زریاب خٹک کا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ خان زریاب کے ہاتھوں اس کے بابا جان کے ہاتھ مارے جانے میں اس عورت کا کردار کیا رہا ہے۔ وہ تو اتنا جانتا تھا کہ ماں نے ہمیشہ مومنہ نامی خاتون کا غائبانہ تعارف اس سے بڑے احترام اور محبت کے ساتھ کیا ہے۔ وہ اس محبت کی وجہ جاننے سے قاصر تھا۔ زریاب خٹک جیسے درندے سے اتنی نفرت تو پھر اس کی بیوی کا ذکر اس نے اچھے الفاظ میں کیوں؟

اب بھی ماں کا حکم نامہ پڑھ کے دل الجھ گیا۔ اسے اپنی بی بی کی بے مقصد سی خواہش سراسر فضول لگ رہی تھی۔ اگر وہ لب لبور سے اس عورت کے کفن و دفن کا بندوبست ہی کرنا چاہتی ہیں تو کسی بھی قابل اعتماد ملازمہ کے ہاتھوں فریضہ ادا ہو سکتا ہے۔ جان محمد بھی یہ کام کر سکتا ہے۔ اس نے فون پہ ہلکا سا احتجاج کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اسے مسترد کر دیا گیا۔

”اس نے کسی اپنے کی خواہش کی ہے خوشنود اور محمد کے بعد اس کی اولاد۔“

زیادہ اور کون اپنا ہو سکتا ہے۔ تم بحث میں وقت ضائع کرنے کے بجائے فوراً لاہور پہنچو، ہو سکتا ہے اسے تمہاری ہی ضرورت ہو اور اس کی سانسیں کچھ دن اور رہ جائیں۔“

بڑی بی بی سے وہ اپنا سارا پروگرام اپ بھٹ کر کے لاہور جانے کے لیے نکلا۔ وہاں دیے گئے ایڈریس پہ پہنچ کر ایک انجمنی زبان والی مریضہ کے پاس پہنچا۔ وہاں سے بڑی دقت کے ساتھ اپنا مدعا بیان کر پایا۔ وہ اسے لے کر سرور سہاسپتال لے آئی جہاں کوریڈور میں زمین پہ پڑی اس عورت کی حالت دیکھ کے وہ دہل گیا یہ تو وہ جانتا تھا کہ سرکاری ہسپتالوں میں غریبوں کا ”مفت علاج“ کس طرح ہوتا ہے، لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ اگر غریب کے ساتھ ساتھ کمپرسی اور لاواری بھی ہو تو مریض کو اس طرح بے یار و مددگار ننگے فرش پہ مرنے کے لیے ڈال دیا جاتا ہے۔

اس وقت اسے کچھ یاد نہ رہا سوائے اس کے کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے اور اس کے سامنے ایک ایسا مریض ہے جیسے مریضوں کے لیے اس نے فیروز ہاسپتال بنانے کا خواب دیکھا

ہے، شیخ زائد ہاسپتال میں محمود غزنوی کو وہ جانتا تھا جو اس کے ساتھ لندن میں ہوتا تھا وہ وہ بچی کچی سانسیں لیتے اس نڈھال سے وجود کو وہیں لے گیا۔ محمود کے دماغ میں بھی موت سے لڑنے کا سودا سمایا تھا۔ اس نے ایک چیلنج کی طرح اس مریضہ کو قبول کیا جس کا کینسر لاسٹ اسٹیج پہ تھا اور جو دل کے انتہائی شدید دورے کے بعد کوئی مناسب طبی سہولت میسر نہ ہونے کے بعد بھی زندہ تھی اور اسے مزید کچھ دن بھی زندہ رکھنا ایک امر دشوار تھا، لیکن شاید خدا نے اس کی عمر بڑھا رکھی تھی، یا اس کے جیسے کے کچھ مزید تماشے دیکھنے رہتے تھے کہ خوشنود اور محمود کے اندر کے ضدی ڈاکٹر تھک کے ہار نہ مان رہے تھے۔

سنگ پور جانا، ہاسپتال کے دیگر معاملات، خوشنود کو کچھ بھی نہ یاد رہا۔ رہی سہی کسر اتفاقاً ملنے والی مقدس نے پوری کر دی۔ وہ اپنی زندگی کے اس نئے اور خوش کن موڑ پہ حد سے زیادہ حیران تھا۔ ابھی تو وہ دل میں بیٹنے والے نئے نویلے سہانے سے جذبے کو محسوس کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا ابھی تو وہ آنکھوں کی چٹلیوں میں ڈولتے اس عکس کے رنگ بھی نہیں گن پایا تھا کہ یہ ایک جھٹکا.....

اس کی ذہنی رو پھر سے چند منٹ پہلے ہاسپتال میں پیش آنے والے واقعے کی طرف چلی گئی۔

”مما.....!“ یہ ایک لفظ اسے خود سے کتنی دور لے گیا تھا جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی کتنی اپنی اپنی سی لگتی تھی۔

جب وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا تو اسے پانا کتنا سہل لگتا تھا۔ اور اب جب وہ اس کے بارے میں سب جان گیا ہے تو اسے سوچنا بھی ایک ناگوار امر محسوس ہو رہا ہے۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ بدلے اور انتقام کی تپش اس کے دل تک نہیں پہنچ پائی۔ یہ بھی درست کہ اس کی سوجائی کی طرف مائل فطرت کسی کا خون بہانے کا سوچ بھی نہیں سکتی اور یہ بھی ایک حقیقت کہ ماں کی تربیت اور اعلیٰ تعلیم نے اسے عداوت و حقارت کے جذبے سے کوسوں دور ہی رکھا لیکن پھر بھی..... پھر بھی کیا وہ اپنے اندر یہ تسلیم کرنے کی ہمت پاسکے گا کہ وہ اپنی باپ کے قاتل کی بیٹی سے محبت کرنے لگا ہے۔ ”نہیں ہرگز نہیں۔“ اس نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔

”میں کچھ بھی کر لوں اتنا اعلیٰ ظرف تو کبھی نہیں ہو سکتا۔“ اس نے خود سے ہار مان

کے اپنی کمزوری تسلیم کی۔

ٹرن..... ٹرن فون کی بیل پہ اس نے اپنے حواس مجتمع کیے، دوسری جانب ڈاکٹر محمود غزنوی کی پرجوش آواز تھی ”خوشنود علی، معجزہ ہو گیا..... میں اسے معجزہ ہی کہوں گا۔ تمہاری پشت مومنہ خاتون آج آئی۔ سی یو سے پرائیویٹ روم شفٹ کر دی گئی ہے۔ انہیں ہوش آ گیا ہے۔ میرے خدشے کے برعکس وہ کوئے میں نہیں گئیں اور نہ ہی ان کی ذہنی حالت کو کوئی فرق پڑا ہے تم چاہو تو ابھی ان سے مل سکتے ہو۔“

نڈھال سا پڑا خوشنود نے سرے سے پر غم ہو گیا۔ وہ یہاں ایک مرتی ہوئی عورت کی آخری خواہش پوری کرنے آیا تھا، لیکن قدرت نے اسے سالوں سے سربستہ رازوں سے واقف ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ وہ اس موقع کو گنوا نا نہ چاہتا تھا۔ چند ہی منٹوں میں وہ اس کے روبرو تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے کمرے میں گھٹنوں میں سر دیئے زار و قطار روئے جا رہی تھی اور شناور اسے خاموش کرانے کی ہر کوشش میں ناکام ہو کے اب خود رو دیئے والی ہو رہی تھی۔ ”مقدس، اپنی جان لے لو گی تم یوں رو رو کے۔ آخر بتاتی کیوں نہیں کیا ہوا؟ کہاں گئی تھیں تم؟“

”میں ہاسپٹل گئی تھی شانو اور..... اور وہ میری ماما ہی ہیں۔“ اس نے بدقت چند الفاظ کہے اور پھر سے ہچکیاں بندھ گئیں۔

”وہی میری ماما ہیں..... میں فوراً پہچان گئیں انہیں دیکھتے ہی۔ وہ مجھے دیکھ نہیں سکتیں ورنہ شاید وہ بھی مجھے پہچان لیتیں، لیکن نہیں..... پہچانتے تو انہیں چاہیے۔“

وہ بھلا کہاں یاد رکھ پائی ہوں گی کہ ان کی ایک بیٹی بھی ہے۔ ”کیسی باتیں کر رہی ہو؟ اگر وہ تمہاری ماں ہیں تو پھر..... خیر یہ بتاؤ ڈاکٹر صاحب کیسے جانتے ہیں اماں مومنہ..... میرا مطلب ہے آنٹی کو؟“ اس کے سوال کے جواب میں وہ چپ رہی۔

کچھ اندیشے تھے جو اسے کھل کے ماں کے ملنے کی خوشی بھی نہ منانے دے رہے تھے۔ وہ ان خدشات کا اظہار کر کے اپنی ذات کو کسی کی نظروں میں بے وقعت نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن مقابل شناور گل تھی جو اس کی تہہ سے بھی اصل بات کھوج لاتی۔ مسلسل سوال

کر کر کے اس نے یہ اگلو ہی لیا کہ ڈاکٹر خوشنود علی، فیروز وردگ کا بیٹا ہے، اس فیروز وردگ کا جس کے بے لوث دوستی کے قصیدوں سے اس کے بابا جان کی ڈائری بھری پڑی ہے اور اس فیروز وردگ کا بیٹا جس کے ذکر سے اس کے گھر میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ جس کے نام کی دہشت سے بی بی جان اور تایا جان اپنے لاڈلے زیریاب خشک کی خیر مانگتے ہیں۔

”واٹ، ہاؤ سر پرائزنگ، کتنا افسانوی سا لگ رہا ہے۔ یوں سچ در سچ اتفاقات کی کڑی ملتے جانا۔ اس سے تو صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ قدرت خود تمہاری رہنمائی کر رہی ہے، وہ خود ان رازوں کو تمہارے سامنے کھولنا چاہتی ہے اور تم بے وقوف یوں منہ اٹھائے واپس چلی آئیں کہاں تو ماں کی تلاش میں دیوانی ہو رہی تھیں اور کہاں ان کے ملتے ہی سب چھوڑ چھاڑ یہاں اندیشے میں آنسو بہانے میں لگن ہو۔“

”لو کیا کرتی، میں جانتی ہوں اس اسرار کے پردے میں میرے لیے کوئی خوش کن انکشاف نہیں ہے۔ کاش مجھے ملتی ہی نہیں یا پھر..... یا پھر وہ مجھے زندہ نہ ملتیں۔“ اس نے بے رحمی سے کہا۔

”کیا بکو اس کر رہی ہو؟“

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔ بابا کی ڈائری نے میرے ذہن میں ان کا ایک پیکر تراش دیا تھا۔ انہیں ان بھری باتوں کو نظر انداز کر کے میں نے انہیں ہمیشہ ہی اپنے تصور میں ایک لڑکی اور باوقار خاتون کی حیثیت سے سوچا۔ لوگ کیا کہتے ہیں مجھے کبھی اس کا یقین نہ آیا۔ انہیں..... شانو..... تم خود سوچو..... سارے زمانے سے کٹ کر..... اولاد اور شوہر کو بھلا..... زندگی کے اس انتہائی موقع پر آج اگر کوئی ان کے پاس ہے تو اسی شخص کا بیٹا جس کا نام ان کے ساتھ اتنی ذلت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ میں ڈر لی ہوں شناور کہ کہیں یہ سب سچ ثابت نہ ہو جائے۔“

”خواتواہ کے اندیشے ہیں تمہارے دل میں، میری یہ بات یاد رکھو مقدس زیریاب کہ ادھورا علم ہمیشہ تکلیف دیتا ہے۔ اگر تم اس سچی میں ہاتھ ڈال ہی چکی ہو تو اب اس کے تمام سرے سلجھانا تم پر فرض ہے۔ اب سچ چاہے جو بھی نکلے اسے ہمت اور حوصلے کے ساتھ قبول کرو۔ لیکن پہلے سچ کی تلاش تو کرو ہو سکتا ہے سچ اس سے بالکل مختلف ہو جو تمہیں دکھائی دے رہا ہے۔ اب تک ایسا کتنا کچھ ہو چکا ہے جو تمہاری توقعات کے بالکل

برخلاف ہے۔ پھر اب ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ خود سے ہی متنی انجام فرض کر کے بیٹھ جانا حماقت ہے اور ماں جیسے رشتے پہ بغیر کسی واضح ثبوت کے اتنی بدگمانی سراسر گناہ ہے۔“ اس کے سمجھانے بجھانے پہ وہ پھر سے نئی حقیقتوں کا سامنا کرنے پہ تیار ہوئی۔

☆☆☆

”فیروز لالہ.....“

دھندلائی ہوئی آنکھوں سے سامنے موجود اونچے لمبے سراپے کو دیکھ کے اس کے لبوں سے سرسراتا ہوا نام نکلا۔ ہوش میں آنے کے بعد یہ پہلا مانوس چہرہ تھا جو اس نے دیکھا اور جسے دیکھتے ہی اسے احساس ہوا کہ شاید ہوش میں وہ اب بھی نہیں آئی ہے۔ بے یقینی سے پلکیں جھپک کے اس نے دوبارہ غور کرنے کی کوشش کی، وہ چہرہ اور قریب آیا۔

”میں خوشنود علی ہوں اور میری ماں نے کہا تھا کہ میں آپ کو پھوپھو بھی جانا کہہ کے رکھا ہوں۔“ بیڈ کے کنارے بیٹھ کے اس نے آہستہ آواز میں کہا تو اسے یقین آ گیا کہ وہ واقعی ہوش میں ہے۔ ڈرپس لگے ناتواں ہاتھ اٹھا کے اس نے اس چہرے کو چھونا چاہا۔

”خوشنود..... اتنا بڑا..... کتنا وقت گزر گیا..... آہ“ اس کی ہلکی بھوری شہد رنگ آنکھوں کے گوشوں سے چند آنسو پھسل کے اس کے اچھے بالوں میں جذب ہو گئے۔

دھندلائی آنکھیں مسکرائیں۔

”تو تمہیں لائی نے بھیجا ہے۔ میں نے اس سے کیا مانگا تھا اور اس نے کیا بھیج دیا۔ تم نے میری سزا اور بڑھادی ہے لائی۔ مجھے زندگی نہیں چاہیے تھی۔ مجھے چار پھولوں اور ایک عدد دعائے مغفرت کی حاجت تھی تم نے تو مسیحا بھیج دیا۔“

اس کا لہجہ حد درجہ صاف تھا۔ خوشنود کو حیرت ہوئی۔ خود اس کی ماں بھی اس کے لکھنے کے باوجود اتنی صاف اردو نہ بول پاتی تھی جب کہ یہ پہاڑی علاقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اتنی رواں اور شستہ اردو..... شاید لاہور اتنا عرصہ رہنے کی وجہ سے ہے۔

”میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں پھوپھو جان۔“ سسکی بھر ہڈیوں والا یہ بے بس وجود خود بخود اسے تکریم کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

”آہ..... میں جانتی تھی کہ زندہ رہی تو ضرور کوئی نہ کوئی کچھ پوچھنے والا آئے گا۔ لیکن میرے پاس بتانے کو کچھ بھی نہیں، میں تو اب تک یہ بھی نہیں جان پائی کہ پھولوں کے رنگ کالے کیسے ہو جاتے ہیں۔ تمہیں کیا بتاؤں۔“ اس کی وحشی رونجانے کہاں بھٹک گئی۔ وہ کچھ

نہیں سمجھا پھر کچھ لمحے رک کے پھر سے اپنا سوال دہرایا۔

”میں نہیں جانتا کہ خود کو چھپا کر رکھنے میں آپ کی کیا مصلحت تھی، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ آپ کے سینے میں چھپے چند حقائق بہت سی زندگیوں کو بھٹکنے سے بچالیں گے۔ سالوں سے یہ سوال مجھے بے چین کیے ہوئے تھے۔ مختلف لوگوں کے پاس اس کے مختلف جواب تھے میں صرف سچ جانا چاہتا ہوں۔ فیروز علی کا بیٹا ہونے کے ناتے مجھے اتنا حق تو ہے ناں۔“ اسے بولنے پہ آمادہ دیکھ کے خوشنود نے مزید کہا۔

”سب ڈاکٹر کہتے ہیں کہ آپ کا سچ جانا ایک معجزہ ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ معجزہ صرف اس لیے رونما ہوا ہے کہ آپ سچائی کو دنیا کے سامنے لائیں۔“

”ہر سچ سامنے لانے کے لیے نہیں ہوتا۔ کچھ سچ کڑوے گھونٹ کی طرح پی جانا پڑتے ہیں۔“

”نہیں، کڑواہٹ کو پی جانا دانشمندی نہیں۔ اسے تھوک دینا چاہیے۔“ خوشنود نے

کہا۔

☆☆☆

وہ کمرہ جو عرصے سے موت کی آئینیں سن رہا تھا ایک بیک چہکاروں سے گونجنے لگا۔ خان درباب خلک کا اجڑا ہوا پیار کمرہ آج آباد تھا۔ ان کا ہلڈ پریش لخت جگر کو سامنے پا کے خوشی اور مسرت سے بلندی کو چھو رہا تھا۔ بوڑھا جھریوں زدہ چہرہ سرخ ہو کے دھکنے لگا تھا۔

”جہاں کی زیادتی ان کی لکنت زدہ زبان کو اور بھی مجبور کر رہی تھی۔ وہ بار بار کچھ کہنے کی کوشش کرتے۔ درباب باپ کا ہاتھ نم لبوں سے چوم کر رہ جاتا۔ ہر بار اس کی آنکھوں سے سحانی کے خواستگار چند پشیمان سے آنسو ان کے ہاتھ تر کر دیتے۔“

”مظرتی بی بی کے چہرے سے وہ گھبراہٹ مفقود تھی جس نے گزشتہ کئی دنوں سے ان کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ خان افراسیاب اور خان دراب سرخرو سے کھڑے باپ بیٹے کے والہانہ ملن کو دیکھ رہے تھے۔ نئی نسل کے بہت سے نمائندہ جنہوں نے اپنے ہوش میں پہلی بار خلک فیملی کے مٹھلے بیٹے کو دیکھا تھا، فرط اشتیاق سے گھیرا بنائے کھڑے تھے۔“

ان میں خان دراب کی نیگم بھی تھیں، واحد وہ تھیں جنہیں اس موقع پر مقدس کی غیر حاضری بری طرح کھل رہی تھی۔ وہ بار بار زریاب کے چہرے کی جانب دیکھتیں شاید اب وہ اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ پوچھیں۔ انوشہ اور پلوٹہ کو دیکھ کے اس کی آنکھوں میں

تجسس اور اشتیاق کی ایک لہر آتے ضرور دیکھی گئی تھی لیکن اب باچا جان کی ناگفت بہ حالت شاید اس کا دھیان بٹے نہ دے رہی تھی۔

”جی باچا جان، کہیے، کیا کہنا چاہتے ہیں، میں آپ کا مجرم ہوں، جو کہنا چاہتے ہیں کہہ دیجئے۔ میں اس سے بھی زیادہ کا حق ہوں۔“

لاغر باپ کی بے بسی اور بے چینی محسوس کر کے زریاب نے دونوں ہاتھوں سے انہیں تھام کے خود کو سزا کے لیے پیش کیا وہ باپ کی اس حالت کا سراسر قصور وار خود کو سمجھ رہا تھا۔ باچا جان نے نفی میں سر ہلایا۔

”نہ..... میں تم..... تمہارا..... تمہارا مجرم..... بس اس لیے زندہ..... تم..... تمہیں بتا دوں..... معافی..... معاف کر دو۔“

یہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ تمام افراد کو سنا کر گئے شاید باچا جان کی ذہنی کیفیت نارمل نہیں۔ اس کا اندازہ کر کے افراسیاب خٹک نے انہیں آرام کا مسودہ دیتے ہوئے بی بی جان اور زریاب کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ لیکن ارباب خٹک نے التجائیہ انداز میں بیٹے کا ہاتھ تھام لیا اور منت کے ساتھ اپنی شریک حیات کو دیکھنے لگے۔

”نہ..... نہ جاؤ..... میں ایسے نہیں مرنا..... پہلے یہ بوجھ..... موت..... آسان..... کر دو..... حضرت..... حضرت..... خدا کے لیے..... حضرت.....“

بی بی جان کا نظریں چراتا تینوں بیٹوں کو ٹھکنے پہ مجبور کر گیا۔ زریاب تو ابھی خود سوچنے سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا البتہ افراسیاب نے کسی انہونی کے خدشے کے بغیر نظر بچوں اور خواتین کو باہر جانے کا حکم یہ اشارہ دیا۔ تا کی جان سب کو لے کر خاموشی سے نکل گئیں۔ بی بی جان لرزتی ٹانگوں پہ ہاتھ دھرتے صورتوں پہ نظر پڑا۔

”باچا جان کیا کہنا چاہتے ہیں بی بی جان؟“ خان افراسیاب خٹک کے لہجے میں کچھ تھا جو حضرت بی بی کے سرخ و سفید چہرے پہ زبردی چھا گئی۔

”حضرتی..... بتا دو..... تم..... تم کو اللہ کا واسطہ..... یہ اولاد..... کا بھلا..... گناہ..... گناہوں کا کف..... کفارہ..... سب بتا دو..... اب تو سب..... کچھ..... بتا دو.....“ بولتے بولتے وہ ہانپنے لگے۔ اچانک بی بی جان دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کے رونے لگیں۔ زریاب مچل کے اٹھا۔

”بس کریں بی بی جان..... خدا را یوں مت روئیں اور آپ لالہ..... آپ بھی

بس..... باچا جان بیمار ہیں..... کمزور ہیں ہم نہیں جانتے وہ کیا کہنا چاہ رہے ہیں آپ بی بی جان پر تو دباؤ مت ڈالیں وہ پہلے ہی پریشان ہیں۔“

”نہیں زریاب، میں پریشان نہیں، پشیمان ہوں..... خان جی ٹھیک کہتے ہیں کم از کم اب تو..... زندگی کے ان آخری دنوں میں اب تو مجھے سچائی سب کے سامنے لے آنی چاہیے۔ کاش میں نے پہلے ہی ان کی بات مان لی ہوتی تو اتنا کچھ نہ کھونا پڑتا۔ اک ذرا کچھ بچانے کے لیے میں نے سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ اپنا گھر، تمہارا گھر، تمہیں، خان جی کو..... اب بھی شاید میرے بتانے سے کچھ بچ جائے میرے پاس نہ سکی تمہارے پاس ہی سہی۔“

ان کی نظریں بیٹے کے ماتھے جھکی ہوئی تھیں۔

”بی بی جان..... میں بہت شکستہ ہو چکا ہوں..... کچھ تاب لانے کی مجھ میں مزید ہمت نہیں رہی یہ دل اب اور کوئی گھاؤ سہہ سکتا ہے۔ مجھے مزید مت الجھائیں میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ جو کہنا ہے صاف صاف کہیں۔“

☆☆☆

”میرا سب سے پہلا رشتہ اجنبیت کا تھا۔“ مومنہ نے بتانا شروع کیا۔

”سب سے پہلے جو احساس میرے دل میں جاگا وہ اجنبیت کا تھا۔ جو فضا میرے آس پاس موجود تھی وہ اس فضا سے الگ تھی جس کی باس مجھے اپنے باپ سے آتی تھی۔ میرا آپ جس زبان میں مجھے کلمے یاد کراتا تھا جو اس زبان سے الگ تھی جس میں میری ماں..... لوریاں..... بیتی تھی..... اپنے گرد و پیش سے یہ اجنبیت اور بڑھ گئی جب پہلے میری ماں..... انشقا..... ہو امیر کے باپ کے میرے گرد اپنا دائرہ اور محدود کر دیا وہ مجھے اجنبی ہواؤں، اجنبی صداؤں سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔“

میری ماں کالا لاش کے پہاڑوں کی رہنے والی تھی، کافر قبیلے سے تعلق تھا اس کا اور میرا باپ پنجاب سے تعلق رکھتا تھا، اپنی جوانی میں لاہور سے کالام گھومنے آیا اور میری ماں کا اسیر ہو کے ہمیں کاہور ہا۔

یہ وادی پیار محبت کے متوالوں کے لیے بڑی سازگار ہے۔ دیوار نہیں بنتی فقط چند پابندیاں لگاتی ہے۔ میرے باپ نے یہ پابندیاں قبول کر لیں جو اس وقت اسے بہت سہل معلوم ہوتی تھیں لیکن میری پیدائش سے وہ سمجھ گیا اس کے اندر کا مسلمان باپ فکر مند

ہو گیا۔ وہ ہر وقت مجھے کافر رسم و رواج سے بچانے کی سعی میں مگن رہتا۔ میری ماں کی موت نے اس کے لیے واپسی کی راہ کھولی لیکن بچانے وہ کون سی نادریدہ بیڑیاں تھیں جنہوں نے اس کے پیر، بمبوریٹ کی وادی سے باندھ دیئے تھے۔

میں اس وادی میں رہتے ہوئے بھی سب سے الگ تھی۔ سب سے کٹ کے رہنے میں جو اذیت ہے اس کا مزہ میں آج سے نہیں لے رہی یہ تو میرے بچپن کا تجربہ ہے۔ تنہائی نے ایک نشے کی طرح ایک لت کی طرح مجھے جکڑ لیا۔ یہ تنہائی تب اور تکلیف دہ ہوئی جب ابا بھی مجھے چھوڑ کے چلا گیا اس کے بس میں ہوتا تو وہ کبھی نہ مرتا۔ آخری دنوں میں ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور مجھے یہ شرمندگی کہ محض میری ذات کی وجہ سے ابا اپنے عشق کو غلطی کہنے پر مجبور ہو گیا۔

مجھے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہوئی صرف میری وجہ سے اس لازوال عشق پر یہ دھبا۔

ابا پچھتا رہا تھا کہ ماں کے مرنے کے بعد وہ کبھی نہ مجھے لاہور لے گیا۔ شاید اس کے رشتے دار بھی مجھے تسلیم نہ کرتے لیکن ابا کو یہ اطمینان تو رہتا کہ وہ کلمہ گولوگوں میں اپنی بیٹی چھوڑے جا رہا ہے۔ میرے ہر طرح سے یہ یقین دلا دینے پر کہ میں ہر حال میں اسلام پر قائم رہوں گی کسی کافر سے شادی نہیں کروں گی، ابا نے سکون سے آنکھیں موندیں بعد میں مجھے لگا ابا کے خدشے تقریباً بے بنیاد تھے، ہستی کے لوگ جاہل تھے، کافر تھے، جنگلی تھے مگر پیارے تھے۔ جو پیار کرتے ہیں انہیں پیارے ہی کہا جاتا ہے ناں۔ کسی نے میرے ایمان کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔

میں اجنبیوں کے درمیان بھی بڑی سہولت سے زندگی گزار رہی تھی کہ ایک دن وہ آیا جسے پہلی نظر دیکھ کے ہی مجھے سالوں سے روزِ فجر سے ناگنی اپنے دعاؤں کے پورا ہونے کا یقین آنے لگا۔ وہ زریاب تھا۔ جس نے ابا کی قبر پر فاتحہ پڑھ کے مجھ سے اپنا رشتہ اور پکا لیا۔ میں اسے چاہنے لگی ویسے ہی جیسے کوئی بھی کسی کو چاہ سکتا ہے۔ بغیر کسی طلب کے، بغیر کسی چاہ کے، بغیر کسی صلے کے..... میں اسے چپ چاپ چاہتی رہتی تا عمر، چاہے وہ چاہتا یا نہ چاہتا، چاہے یہاں رہتا چاہے چلا جاتا۔ مجھے کوئی فرق نہ پڑنے والا تھا۔ لیکن ایک عجیب سی بات ہوئی اسے بھی مجھ سے چاہت ہو گئی۔ لیکن یہ ویسی چاہت نہ تھی جیسی کسی کو بھی کسی سے ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ضدی خان زادے کی چاہت تھی جو ہر من چاہی چیز کو اپنا

دیکھنا چاہتا ہے۔

میری محبت ایک بخارن محبت تھی، عاجز، مسکین، ہر حال میں راضی خوشی رہنے والی صابر شا کر محبت اور اس کی محبت نوابی تھی، جلالی تھی، طوفانی تھی سب بہا کے ساتھ لے جانے والی۔ اسے اس بات سے فرق پڑتا تھا کہ میں اس کی ہو کے رہوں یا اس وادی کی۔ یہ فخر مجھے اونچا کر گیا لیکن میں کم ظرف نہ تھی اپنے ابا کا حشر دیکھ چکی تھی۔ مرتے دم بھی اس کی آنکھوں میں جو پچھتاوے تھے اس نے مجھے محتاط کر دیا تھا اور میں نے عشق اور ذہن کو الگ الگ رکھنے کا فیصلہ کر رکھا تھا لیکن زریاب کے لیے عشق ہی سب کچھ تھا، عشق ہی اس کا عشق ہی آس، عشق ہی زندگی اور عشق ہی موت، وہ وصال کے بغیر عشق کو سوچنے کا حوصلہ بھی نہیں دیتا تھا۔

اس نے مجھے شادی کی پیش کش کی۔ میں چاہتی تو ایک جست لگا کر اس اجنبی دنیا سے نکل سکتی تھی لیکن میں نے اسے بھی بہت کچھ سوچا۔ اگر میں زریاب کو اپنے اما کی طرح یہاں رہنے پر مجبور کرتی تو ایک پھر وہی کہانی دہرائی جاتی۔ میں جانتی تھی وہ اپنے عشق اور طلب میں اتنا دیوانہ تھا کہ جسے عیش و آرام ترک کر کے میرے پاس پہاڑوں پہ بنے لکڑی اور گارے کے مکان میں زندگی گزارنے پہ تیار ہو جاتا لیکن میرا عشق اپنی ماں کی طرح خود غرض نہ تھا۔

میں جانتی تھی چند سال پہلے اپنے خون کے رشتوں سے جدائی اسے ابا کی طرح ادھورا انسان بنوے گی اور میں جانتی تھی کہ اس کی دنیا میں میرے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ اس کے دل پہ تو شاید میں حکمرانی کر لوں لیکن اس کے گھر میں مجھے ایک ان چاہے فرد کی حیثیت حاصل رہے گی۔ مجھے اپنی انا اور ذات کا غرور ہمیشہ بہت عزیز رہا ہے۔ ان سر بلند پہاڑوں اور اونچے پیڑوں کی سنگت نے اپنی ہی خوشبو پیدا کر دی تھی مجھ میں، مجھ سے کسی کی ٹیڑھی نظریں برداشت ہوتی تھیں نہ ہی کسی کی آنکھیں اٹکی۔ مجھے اکیلا رہنا منظور تھا لیکن کم حیثیت زندگی نہیں۔ میں محبت کے بدلے رسوائی اور بے عزتی قبول کرنے پہ تیار نہیں تھی۔

میں نے اس سے شادی سے انکار کر دیا کیونکہ میں جانتی تھی وہ صرف مجھے محبت دے سکتا ہے اپنے اعلیٰ نسب گھرانے سے وقار نہیں دلواسکتا۔ بے توقیر ہو کے رہنا مجھے منظور نہیں تھا اس لیے اس کی ہر درخواست میں نے رد کر دی۔ حتیٰ کہ ایک دن اس کا عزیز دوست

فیروز اس کی حالت برداشت نہ کرتے ہوئے مجھے سمجھانے چلا آیا۔ بڑے ہی دلو لے اور اپنائیت کے ساتھ وہ اپنے دوست کی وکالت کرتا رہا لیکن میرے نقطہ نظر واضح کر دینے کے بعد ایک دم چپ ہو گیا۔ مجھے لگا جو بات زریاب کو سمجھانے میں ناکام رہی ہوں، وہ بات فیروز سمجھ گیا ہے۔ میں نے اسے مزید قائل کرنے کی کوشش کی۔

”آج اجنبی لوگوں کی یہ بستی میری سرپرست تو ہے میں اسے چھوڑ کے زریاب کے ساتھ چل پڑوں تو بالکل ہی لاوارث اور بے سائبان کہلاؤں گی۔ زریاب کے دنیا میں صرف میں اور وہ ہی نہیں ہوں گے اس کا پورا خاندان ہوگا۔ اس بھری پری دنیا میں اپنی جگہ کس بل بوتے پر بناؤں گی۔ محبتیں نبھانا آسان ہے لالہ رشتے نبھانا مشکل، میں زریاب کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی اور مجھ سے مشکل چیز اور بھاری ہے جسے سانس لینے کے لیے بھی عزت کی ضرورت ہے، عزت میری بھوکے گھر کے لیے، باقادر میری پیاس سے، محبت صرف عادت، عادت اور ضرورت کے پھیر رہا جاسکتا ہے جھوک اور پیاس سے کوئی کتنی دیر لڑ سکتا ہے۔ میں کم فہم یا خوش فہم نہیں ہوتی جانتی ہوں میں ایک حقیر بے مایہ سی پہاڑن ہوں اور زریاب کے مقابلے میں تو بالکل ہی کم فہم نہیں لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ زندگی کے ہر قدم پر مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس دلانا پڑے۔ ان پہاڑی کی حسیات ان لوگوں میں بہت خوش ہوں۔ یہ لوگ مجھے جانتے ہیں بھیری ماں کو، میرے باپ کو، میری اور میرے خاندان کی تعظیم کرتے ہیں میں پورے وقت مجھے کے ساتھ اس بستی میں بغیر کسی دلی وابستگی، خونی رشتے اور محبت کے زندہ ہوں لیکن وہاں زریاب کی عالی شان حویلی میں میں کس حیثیت سے داخل ہوں گی۔“

”فیروز علی وردگ کی بہن کی حیثیت سے۔“ اس کے فیصلہ کن انداز نے مجھے جو کچھ چاہتا تھا وہ مجھ پر مجبور کر دیا اور ابھی میں سنہلنے نہ پائی تھی کہ اس کا مضبوط ہاتھ میرے سر پر ٹھہر گیا۔

”تم نے جتنی بھی بار مجھے لالہ کہہ کر پکارا مجھے خود پہ خیر محسوس ہوا ہے مومنہ۔ زریاب سے تمہارے متعلق بہت کچھ سنا تھا۔ لیکن خود تم سے مل کر احساس ہوا کہ تم کیسا نایاب گوہر ہو۔ جو عورت محبت پر عزت کو ترجیح دیتی ہو۔ جو آسائشات سے بھری زندگی محض وقار کے لیے ٹھکرا دینے کا حوصلہ رکھتی ہو۔ اس عورت کی عزت بھی کی جاسکتی ہے۔ آج اس لمحے میں نے اپنے دل میں تمہارے لیے بے پناہ عزت و احترام محسوس کیا ہے اتنا کہ جتنا میرے دل میں اپنی ماں کے لیے ہے۔“

اس کی انتہا پسندی مجھے ہواؤں میں اڑانے لگی۔

”لیکن تم مجھ سے چھوٹی ہو اس لیے میں تمہیں بہن کہوں گا۔“

”لالہ.....!“ سسکیوں کے درمیان میرے منہ سے فقط اتنا ہی نکل سکا۔ اس کا ہاتھ میرے سر پہ ہنوز آسمان کی طرح سایہ کیے ہوئے تھا۔ ابا کے بعد زریاب وہ واحد شخص تھا جس سے لگاؤ اور انسیت سے بڑھ کے کچھ محسوس کیا تھا میں نے، جس کی محبت کو پور پور اتار کر میں شانت ہو گئی تھی لیکن رشتہ اور مان محبت اسے کہیں بڑھ کے طمانیت بخش ہوتا ہے یہ مجھے اب اندازہ ہوا۔ فیروز نے مجھ سے یہ مقدس رشتہ جوڑ کے مجھے معبر کر دیا تھا۔

”اور ایک بھائی ہونے کے ناتے میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ تمہارا نکاح آج ہی خان زریاب خٹک سے کر دیا جائے گا لیکن اس سے پہلے کہ تم میری نیت پہ شک کرو میں یہ واضح کر دیتا ہوں کہ تم لالہ کے بعد میرے ساتھ میرے گھر چلو گی۔ زریاب کے والدین میرے پاس آ کر باقاعدہ تمہارا رشتہ طلب کریں گے اور میں ایک باپ کی طرح اپنے گھر سے تمہیں رخصت کروں گا۔“ اس نے بڑے استحقاق سے فیصلہ سنایا۔

”میں یہ عہد کرتا ہوں مومنہ علی کہ میرا گھر تمہارے لیے ہمیشہ میکے کی طرح آباد رہے گا۔ چاہے میں رہوں یا نہ رہوں۔ اس گھر سے تمہیں میکے کا تمام تر مان اور وقار ملے گا۔ تمہارے نام کے ساتھ اب فیروز علی وردگ کا بھاری بھر کم حوالہ ہے۔ تم زریاب خٹک کے گھر کم حیثیت اور ان چاہے خود کی حیثیت سے داخل نہیں ہو گی۔ یہ میرا، ایک خالص بہنوئی کا عہد ہے۔“

اور میں اس عہد پہ ایمان لا کے ہامی بھر بیٹھی، عورت بھی کتنی عجیب چیز ہے، محبتوں کے بارے میں لاکھ شدت اور انصاف پسندی کا دعویٰ کرے، کہیں نہ کہیں ڈنڈی مار ہی دیتی ہے، میری ماں اپنے عشق میں اتنی بچی تھی کہ موت کو گلے لگا بیٹھی لیکن جیتے جی ابا کے لیے اپنے رشتے داروں کو چھوڑنے کا حوصلہ نہ کر سکی اور میں..... زریاب خٹک کے لیے..... اپنے محبوب کے لیے اتنی بے لوث ہو کر سوچتی تھی کہ خود کو تباہ کر لینا منظور تھا، اسے کسی امتحان میں ڈالنا گوارا نہ تھا، میں ڈرتی تھی میری شدت پسندی اور اتنا پرستی اس کے لیے مسائل کھڑے نہ کر دے اس لیے خود کو محروم کرنا گوارا کر لیا تھا میں نے اور فیروز خان اس کی بار میں کتنی خود غرض بن گئی..... یہ نہ سوچا کہ مجھے تحفظ دینے کا عہد کرنے والا کہیں کسی مشکل میں نہ پڑ جائے۔ اس نے میرا اعتماد بحال کیا اور میں نے بڑی آسانی سے اپنا

ہر اچھا برا اسے سوئپ کر خود کو بے فکر کر لیا۔ پھر وہی سب ہوا جیسا اس نے طے کیا تھا۔ چند مشکلات کے بعد سب ٹھیک ہو گیا۔ میں چند ہی دنوں میں بیاہ کر زریاب کی حویلی آگئی اور پھر وہ دور شروع ہوا جو میری زندگی کا سب سے حیران کن دور تھا۔ تم جاننا چاہو گے کہ حیران کن کیسے؟ تو وہ اس طرح کہ میرے تمام تر خدشے بھر بھری ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔ نہیں ایسا نہیں تھا کہ زریاب کے گھر والوں نے مجھے با آسانی اور کھلے دل کے ساتھ قبول کر لیا تھا۔ وہاں میرے لیے سرد مہری تھی، اہتمام تھا۔ زریاب کی بی بی جان مجھے مسلمان ماننے پہ تیار نہ تھیں وہ اور ان کی خاص ملازمتیں تک باقاعدہ مجھ سے کتراتیں۔ کوشش کی جاتی کہ میں اپنے کمرے تک محدود رہوں لیکن جانے ہو حیران کن بات کیا تھی..... وہ یہ کہ یہ تمام اہانت آمیز رویے بھی مجھے بھڑکانے کے لیے جو اس بات سے ڈرتی تھی کہ کہیں سرد رویے مجھے بے موت نہ کر دیں ہر کسی سے مخفی ہو کر رہ گئی عجیب کھوئے کھوئے دن تھے۔

مجھے سوائے زریاب کے اور کچھ دکھائی نہ دیا، کچھ سنائی نہ دیتا۔ کون مجھے ہندنی کہہ کے بکارتا ہے کون کافر کہہ کر، احساس ہی نہ ہوتا۔ مجھے برتنوں کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی لیکن مجھے اس میں بھی کوئی ہنک محسوس نہ ہوتی۔ میری نماز روزے کو ڈھکوسلا کہا جاتا، میں پروانہ کرتی، شاید اسی کونشہ کہتے ہیں اور شاید اسی لیے کھانے کو بے غیرتی اور ذلت کہا جاتا ہے۔ نشہ چاہے محبت کا ہی کیوں نہ ہو ہمیشہ ہستی کی طرف لے جاتا ہے۔ میں جو جنگی پیڑوں کی طرح سر بلند اور اکھڑ تھی، وادی کے بادلوں جیسی شفاف تھی، انہی نے گائی اور ذلت و تحقیر برداشت کرتی رہی، زریاب سے کبھی اکابرانہ گفتگو نہ کیا۔ وہ اس سے کہتا تھا مجھے کسی بات کا ہوش ہی کہاں ہوتا تھا۔

میں بخارن تھی تو محبت بھی کھٹکول کے سکوں کی طرح گن گن کر کرتی تھی، حویلی میں آئی تو مٹھیاں بھر بھر کے نچھاور کرنے لگی۔ زریاب کی طرح میرا عشق بھی بلا خیز ہو گیا۔ میں..... مومنہ علی جو عزت کو اپنی بھوک اور تعظیم کو اپنی پیاس قرار دیتی تھی۔ اب سانس بھی لیتی تو صرف اس لیے کہ فضا نے آتی زریاب کی خوشبو کو اپنی نس نس میں اتار سکوں۔ زریاب کی دیوانگی بھی جوں کی توں تھی بلکہ جب سے اسے پتا چلا کہ میں ماں بننے والی ہوں وہ میرا پہلے سے بڑھ کے دھیان رکھنے لگا۔

انہیں دنوں زریاب کے بڑے بھائی بھی ڈیوری کے لیے میکے آئی۔ میری

اس سے پہلی ملاقات تھی۔ وہ زریاب کو بے حد عزیز تھی اس لیے میں نے بھی بڑی اپنائیت کے ساتھ اس سے ملنا چاہا لیکن اس کے رویے میں بھی میرے لیے سرد مہری اور گریز کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ جتنے دن رہی مجھ پہ طفر کے تیر تاک تاک کے چلائی رہی۔

بی بی جان کا رویہ ایک خاموش اہتمام تھا لیکن ان کی بیٹی کے رویے کا جارحانہ پن مجھے کبھی کبھی نشے سے جھنجھوڑ ڈالتا تھا۔ میں نے پھر بھی اس کی تلخ مزاجی اور ترش روی کو اس کی صحت کی خرابی پہ محمول کرتے ہوئے نظر انداز کر دیا۔ بچی کی پیدائش کے بعد اس کی صحت مزید بگڑ گئی جس کی وجہ سے اس کا میکے میں قیام طویل ہوتا چلا گیا انہی دنوں فیروز لالہ کی بیوی لالہ بی بی یعنی تمہاری ماں اپنی دیگر رشتہ دار خواتین کے ساتھ مجھے لینے آئی۔ وہ چاہتی تھی کہ فیروز کی خواہش کے مطابق میرے بچے کی پیدائش میرے میکے میں ہو۔ اس توجہ و عنایت پہ میں کھل اٹھی لیکن زریاب سے پل بھر کی جدائی مجھے قبول نہ تھی اس لیے جانے سے منع کر دیا۔

میری بچی مقدس اسی گھر میں اپنے باپ دادا کے گھر میں پیدا ہوئی۔ اس کا نام اس کی پیدائش سے پہلے ہی اس کے باپ نے سوچ رکھا تھا۔ جب وہ پیدا ہوئی تو ہو ہو میری

”اب میں تم سے کہاں تک بچوں گا مومنہ۔ تم کتنے روپ بدل کے مجھے تسخیر کرو

میں نے میرا سر بلند ہو گیا۔ مقدس نے باپ کی توجہ بانٹ لی تو میرے بھی کچھ ہوش بکارتا ہے لگے اب مجھے زریاب کے علاوہ بھی کچھ نظر آنے لگا۔ میں نے پہلی بار تنہائی سے گھر والوں کے اچھے رویے اور گریز کو محسوس کیا۔ غیر جانب داری سے سوچتے ہوئے مجھے کچھ تصور اپنا بھی نظر آیا۔ میں نے خود کو صرف اپنے شوہر تک محدود کر رکھا تھا صرف اس کی محبوبہ کی حیثیت سے یہاں رہ رہی تھی۔ میں نے ایک بہو ہونے کے ناتے خود کو منوانے کی کوشش کی ہی نہیں تھی، اگر بی بی جان مجھے کافر سمجھتی تھیں تو مجھے اپنی حیثیت ان پہ واضح کرنا چاہیے تھی، اپنی جگہ بنانے کے لیے کوئی قدم تو اٹھانا چاہیے تھا۔ میں نے حقیقت پسندی سے سوچتے ہوئے اپنا احساب کیا۔

باچا جان مصر تھے کہ اس بار بیرونی ملک کا رو باری دورے پہ زریاب ہی جائے جب کہ وہ میری اور اب ننھی مقدس کی کشش سے بندھ چکا تھا۔ میں نے ہی اسے جانے پہ

آمادہ کیا ایک بیٹا ہونے کے فرائض سے آگاہی دلائی۔ ایسا کر کے شاید میں خود ایک اچھی بہو بننے کی تیاری کر رہی تھی۔ بمشکل وہ جانے پہ تیار ہوا اس کے جانے کے بعد مجھے اپنے فیصلے کی سختی کا اندازہ ہوا۔ اس کے ساتھ نے کتنی تیز دھوپ مجھ تک آنے سے روک رکھی تھی۔ اس کے جاتے ہی جیسے بھانہڑ جلنے لگے۔ زرسا نگہ کے طعنے ناقابل برداشت ہوتے چلے گئے، میرے اندر کی انا پرست پہاڑن پھر سے جاگنے لگی۔ اچھی اور قابل قدر بہو بننے کا ارمان کہیں سو گیا اور سمجھوتے کے تمام تر منصوبے دھڑے کے دھڑے رہ گئے۔

زریاب کے ہمراہ وہ تمام رویے جو میں سرسری جان کے چھوڑ دیتی تھی، اب جان کو آجاتے۔ میں نے تنگ آ کے اپنے کمرے تک محدود رہنا شروع کر دیا۔ یوں بھی کمرے گھر میں مجھے کوئی منہ لگانے پہ تیار نہ ہوتا تھا۔ بی بی جان مجھے دیکھتے ہی وضو کرنے پر پڑتیں۔ ملازمائیں ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اور دور رہتیں۔ اب جان اپنے کمرے یا پھر مہمان خانے تک محدود رہتے۔ زریاب کے بڑے لالہ شہر میں رہتے تھے ان کے گھر والوں سے میری سرسری ملاقات ایک آدھ بار ہوتی تھی، ان کے رویے میں بھی کوئی خوش آئند جھلک نہ تھی۔ جب کہ زریاب کے چھوٹے بھائی سے میری کبھی ملاقات ہی نہ ہوئی تھی۔

زرسا نگہ ابھی تک علیل تھی اور اس کی بد مزاجی اور بچہ پرانے عروج پہ تھا۔ ہر پختے اس کا شوہر رحیم گل آفریدی اس سے ملنے آتا، ہر بار ہی دونوں میں کوئی نہ کوئی نئی پیدا ہو جاتی جس میں میرے نزدیک سارا قصور زرسا نگہ کا ہی ہوتا ہوگا کیونکہ رحیم گل بڑا مہذب اور پڑھا لکھا نوجوان نظر آتا تھا۔ وہ ہنس مکھ بھی تھا، خوب بھی اور ان کی بیوی سے خاصا کم عمر بھی۔

مجھے تو بیچارے کی قسمت پہ افسوس ہی ہوتا تھا ایک تو بڑی عمر کی بیوی، اوپر سے جاہل، بد زبان اور کم شکل بھی۔ پورے گھر میں وہی تھا جو مجھے خشک خاندان کی بہو والا درجہ دیتا تھا۔ مجھے دیکھ کے تعظیماً کھڑا ہو جاتا، ادب سے سلام کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ جتنا میں زرسا نگہ سے بچ کر رہتی رحیم گل کے آنے پہ اس سے ضرور ملتی۔ وہ تھا ہی ایسا عزت کرنے والا اور عزت کرانے والا۔

اس دن میں حد سے زیادہ بے زار اور اداس تھی۔ مقدس کو سلانے کے بعد میں نے زریاب کو خط لکھا، پہلی بار میں نے اس سے اس کے گھر والوں کے ناروا سلوک کا ذکر کیا۔

ہمارے پہلے میری کوشش ہوتی کہ جتنا وقت بھی وہ میرے پاس رہے ہمارے درمیان کسی دوسرے کا ذکر نہ آئے اور تکلیف دہ ذکر تو ہرگز نہیں۔ لیکن اس دن میں نے اپنی ہر تکلیف اس سے بیان کی۔ اپنی تنہائیوں محرومیوں کا ذکر کیا۔ کس کس طرح میری عزت نفس کو ٹھیس پہنچائی جاتی ہے سب لکھا۔ بیرون ملک خط پوسٹ کرنے کے لیے ظاہر ہے کہ پتہ انگریزی میں لکھا جاتا ہے جب کہ کوشش کے باوجود میں لکھا ہوا پتہ لفافے پہ ہو بہو نہ اتار سکی تو خط لے کر رحیم گل کے پاس چلی آئی۔ وہ رات ہی لگی مروت سے آیا تھا۔

”گل لالہ، ذرا یہ انگریزی کا پتہ تو اس لفافے پہ لکھ دو۔“

میں نے لفافہ اور قلم اس کے سامنے رکھا تو وہ سستی سے اٹھ بیٹھا۔ رجب کا اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔ شب خوابی کا لباس بے شکن تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا اس نے ساری رات اسی کرسی پہ بیٹھے بیٹھے گزار دی ہے، مجھے اس کی مضمحل حالت پہ افسوس ہوا۔

”کیا ہوا لالہ، طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تمہاری۔“

”کچھ نہیں بھابھی! بس سفر کی ٹکان ہے اور..... میری قسمت کا ہم سفر ٹکان اتارنے والا نہیں، بڑھانے والا ہے۔“ اس نے انگلیوں سے اپنا ماتھا مسلتے ہوئے کہا رات بھی زرسا نگہ کے کمرے سے کافی دیر تک تلخ و تند جملوں کی نگرار سنائی دیتی رہی تھی، میں ان کے درمیان موجودگی کی وجہ سے ناواقف تھی پھر بھی میری تمام تر ہمدردیاں رحیم گل کے ساتھ تھیں شاید اس کی وجہ میرے اور میری نند کے سر و تعلقات تھے۔

میں نے اس کا دھیان بٹانا چاہا۔

”چھوڑو لالہ، ذرا ذرا سی بات یہ یوں منہ لٹکانا مردوں کو زیب نہیں دیتا۔“ میں اس کے پلوٹے بھائیوں کی طرح پیش آتی تھی شاید وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا بھی تھا حالانکہ رشتہ اس کا مجھ سے بڑوں والا ہی تھا۔

”ہاں ٹسوے بہانا تو عورتوں کی عادت ہے نا۔ ذرا کوئی زیادتی ہوئی دریا بہا کے دنیا بھر کی ہمدردیاں سمیٹ لیں گی۔ مرد اپنی مردانگی کے زعم میں دل بھی ہلکا نہیں کر سکتے۔“ وہ پھینکی سی ہنسی ہنس کے پتہ لکھنے لگا۔ میں نے یونہی رواداری میں کہہ دیا۔

”تو تم مجھ سے دل ہلکا کر لیا کرو۔ میں بھی تو تمہاری کچھ لگتی ہوں۔ یقین کرو تمہارے دل کی بات میرے دل تک ہی رہا کرے گی۔“

”ہائے اللہ جی، میں برباد ہو گئی..... یہاں تو دل سے دل تک بات پہنچ گئی۔“

دھڑ سے دروازہ کھلا اور سینہ کو بی کرتی زرسا نگہ اندر داخل ہوئی۔ رحیم گل سرخ چہرے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

”بکواس بند کرو زر۔“

”ہائے بی بی جی..... آپ بھی مجھے کوس رہی تھیں ناں کہ شوہر کو راضی نہیں رکھ پاتی اس لیے دو منٹ پاس بیٹھنا گوارا نہیں کرتا۔ آئیں دیکھیں ذرا اس کے پاس نہ بیٹھنے کی وجہ خود دیکھیں۔“ اس نے شور مچا کے بی بی جان کو بھی بلا لیا ان کے ساتھ ساتھ وگمہ اور سرحدی جیسی ملازما میں بھی لپک کے تماشا دیکھنے آ گئیں۔

”میں کہتا ہوں زرسا نگہ، زبان قابو میں کر لو ورنہ.....“

رحیم گل نے دھاڑ کے کہا لیکن اسے ذرا پروا نہ تھی۔

”اسی لیے بہانے بہانے سے روٹھ کے کمرے سے نکل آتا ہے۔ دوسرا کمرہ اس جادو گر نے جو آباد کیا ہوتا ہے۔“

میں سن ہو گئی۔ اس ریک انٹرام نے میری قوت کو بانی ہی سلب کر لی تھی۔ وہ زہر اگلتی رہی۔

”آدھی رات کو میں نے خود اسے بن ٹھن کے اس کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ طبیعت بھری نہیں جو چند گھنٹے بعد پھر سے اندر گھس گئیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا اس کا منہ نوچ لوں لیکن قدم من من بھر کے ہو کر زمین سے اٹھ نہ پار ہوا۔ رحیم گل بھی بیوی کے سفید جھوٹ پہ ہکا بکارہ گیا۔

”نہ بی بی..... ساری رات میں خود زریاب دلہن کے پاس تھی۔ بچی کو بخار آ رہا تھا، بی بی تو ابلی تک نہیں کمرے سے۔“ سرحدی نے خوف خدا سے لڑنے کے گولہ دی

”تو..... بڑھی چل.....“ زرسا نگہ نے عمر رسیدہ عورت کو جھپٹ لیا اور کہا

نوپتے ہوئے وہ بے تحاشا چیخنے لگی۔ بی بی جان بیٹی کی دیوانگی پہ ہراساں ہو گئیں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں چڑھ چکی تھیں، بدن پہ لرزہ طاری تھا اور منہ سے کف بہہ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہے لیکن پھر بھی مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس سے گھن محسوس کر کے شہ پھیر لیا۔

”وگمہ..... اسے سنبھالو..... نجانے کیسا دورہ پڑا ہے بچی کو جب سے بیاہ ہوا ہے کلا کے رہ گئی ہے نجانے کیسا کسی نے تعویذ پھونکا ہے بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا ہے معصوم بچی کا۔“

”ہونہہ معصوم بچی.....“ رحیم گل نے تنفر سے کہا اسے بی بی جان کا بیٹی کے لیے یوں فکر مند ہونا بالکل پسند نہ آیا، انہوں نے داماد اور بہو کے یوں بے عزت ہونے پر اک لفظ تک نہ کہا اور کچھ کہا بھی تو بیٹی کے لیے۔

”دورہ نہیں پڑا..... ذرا سے کرتی ہے پاگل پن کے۔ تاکہ جو مرضی آئے کرتی پھرے کوئی کچھ کہہ نہ سکے کہ بیچاری پاگل جو ہے۔“ رحیم گل نے غصے سے کہا۔

”میں پاگل ہوں؟ میں پاگل نہیں ہوں تم مجھے پاگل کر دو گے؟“

”میری بچی پاگل نہیں رحیم گل۔“ بی بی جان نے سخت لہجہ میں کہا۔ رحیم گل اس پاس پڑی چیزوں کو ٹھوکر مارتا غصے سے کمرے سے نکل گیا۔ میں کسی بے جان چیز کی طرح کونے کی دیوار سے سہی چپکی کھڑی تھی۔ یہ تماشا میرے گمان سے بھی باہر تھا۔ زرسا نگہ کی اکثر حرکتیں مجھے عجیب سی لگا کرتیں لیکن وہ اس حد تک جنونی بھی ہو سکتی ہے مجھے اندازہ نہ تھا۔ اس نے تو شوہر کے ساتھ ساتھ، مجھے..... اپنے بھائی کی عزت کو بھی دو کوڑی کا کر دیا۔

غم و غصے نے مجھ سے اتنی ہمت بھی چھین لی تھی کہ میں بھی رحیم گل آفریدی کی طرح اس کمرے سے نکلنے کا سوچتی اور شاید میری بد قسمتی تھی کہ میں اس کمرے میں موجود تھی۔ زرسا نگہ نے نفرت سے مجھے دیکھا اور اپنا آپ چھڑا کے مجھ پہ جھپٹی۔ اس نے میری چادر کھینچ کر پھینک دی اور گریبان سے پکڑ کے مجھے زمین پہ لا پھینکا۔ میرے من ٹوٹ کے پھرنے لگا میں اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھی اس لیے تعجب تک نہ سکی اور آسانی سے اس کے ہاتھ سے جڑھ گئی۔ اس نے میرے بال نوچ کے مجھے گھسیٹنا چاہا۔ بی بی جان کے کہنے پر میں آگے بڑھیں لیکن تب تک اس نے میرے منہ پہ ٹھانچے مار مار کے میرے دھڑکے جادو کیے تھے میری ناک سے خون بہہ رہا تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ میری چیخ و پکار میرے اندر ہی کہیں دفن ہو رہی تھی۔ اس قدر ذلت مجھے فریاد کرنے بھی نہیں دے رہی تھی وگمہ اور سرحدی نے اسے پکڑ لیا لیکن اس نے زور سے لات مار کے میری پسلیوں پہ وار کیا۔ میں درد کی شدت سے دوہری ہو گئی۔

”کافرن..... ہندی ایک مرد سے تیری تسلی کہاں ہوتی ہوگی۔ چھوڑ میرے بھائی اور شوہر کا پیچھا چلی جا اپنے منہوں پہاڑوں پر وہاں رواج ہوگا چار چار مرد رکھنے کا آزادی سے عیش کرنا۔“

”کافرن ہوگی تو.....“ میں پھٹ پڑی۔

”میں مومنہ ہوں..... مومنہ..... خان زریاب کی من چاہی بیوی..... مجھے چار مردوں کا طعنہ دینے والی ڈائن۔ خواہیک مرد کے قابل بن کے تو دکھا مجھے۔“ میں مزید چپ نہ رہ سکی میری لکار پہ اس نے خود کو چھڑایا۔ لپک کے آتش دان سے جلتی لکڑی نکالی۔ اس کا تیور بھانپ کے میں نے خود کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن میں خود کو مکمل طور پہ اس سے محفوظ نہ رکھ پائی۔ میرے چہرے پہ اس نے جلتی لکڑی رکھ دی۔“

اس وقت کی تمام تراذیت مومنہ کے لہجے میں اتر آئی۔ خوشنود آنکھوں میں درد لیے اس ٹڈ حال چہرے کے اس سیاہ پڑے جسے کو دیکھنے لگا جہاں ایک بے رحم داغ پہ چند آنسو سرک رہے تھے۔

”میرے چہرے پہ اس نے جلتی لکڑی رکھ دی۔“

مقدس کے قدم اس ایک جملے نے باندھ دیے۔ وہ آئی سی یو سے ہوتی ہوئی اس کمرے تک آرہی تھی۔ کمرے میں خوشنود کو پا کے وہ جھٹکی۔ اس وہ سوچ رہی تھی کہ اس کی موجودگی میں اندر چلی جائی یا چپکے سے واپس لوٹ جائے کہ بائیں کی آواز نے اس کا دھیان کھینچ لیا۔ وہ درد میں ڈوبی اس آواز میں گرفتار سی ہو کے دروازے کے ہینڈل پہ ہاتھ رکھے وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ سنسان کوریڈور میں کوئی ذی روح نہ تھا۔ ہاسپٹل کے پرسکون ماحول میں دروازے کے اس پار کھڑی مقدس تک مومنہ کی گفتگو بخوبی پہنچ رہی تھی۔

”میرے چہرے پہ اس نے جلتی لکڑی رکھ دی۔“

مقدس کے رخسار دیکھنے لگے۔ اس نے شدت ضبط سے لب چل ڈالے۔ مومنہ نے گفتگو کا سلسلہ پھر شروع کیا۔

”وہ رات بڑی ظالم تھی۔ ساری شام میں نیم بے ہوشی کے عالم میں اسی کمرے کے ایک کونے میں پڑی رہی تھی۔ جب ہوش آیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے میرے کال کوئی تیلیں رہا ہے۔ میں نے سوچی ہوئی آنکھیں بمشکل کھولیں۔ سرحدی ہاتھ میں مرہم کی پیالی لیے کھڑی تھی۔ برسی آنکھوں کے ساتھ اس نے ہلکی شاید میرے جلے ہوئے رخسار کو صاف کرنا چاہا تھا اور درد کی تیز لہر مجھے گھٹنوں کی بے ہوشی سے کھینچ لائی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پرے کیا۔ مجھے اس کے اور دیگر ملازماؤں کے سامنے ہونے والی تذلیل یاد آ گئی۔ اب ان ہمدردیوں سے اس کا ازلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے گرتے پڑتے اپنی چادر اٹھائی، ڈولتے قدموں سے کمرے سے نکلی۔ سرحدی نے مجھے سہارا دینا چاہا لیکن میں نے اسے جھٹک دیا اس وقت مجھے سب سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔“

رات گہری ہو چکی تھی، مقدس بستر پر لیٹی کلاکاریاں بھر رہی تھی۔ سرحدی کی گیارہ سالہ پوتی اسے کھلا رہی تھی۔ مجھ پہ نظر پڑتے ہی وہ سرا سیمہ ہو گئی۔ جھنجھنا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ اسے قدموں کمرے سے نکل گئی، مقدس اس کو نظروں سے اوجھل پا کے رونے لگی۔ میرے کانوں تک اس کے رونے چلانے کی آواز بہت دور سے کہیں آرہی تھی، میں نے خالی خالی نظروں سے اسے بستر پہ ہاتھ پیر پٹخ کے روتے دیکھا لیکن میرے اندر کوئی تحریک پیدا نہ ہوئی میرا پورا وجود برف ہو رہا تھا صرف آدھا چہرہ جیسے شعلوں کی زد میں تھا۔ میں اس کے برابر لیٹ گئی۔ سرحدی نے آہ بھر کے مجھے دیکھا اور مقدس کو دودھ کی بوتل اور کھلونے سمیت اٹھا کے باہر لے گئی۔ جاتے جاتے وہ میرے سر ہانے مرہم رکھ گئی۔ کئی گھنٹے ایسے پڑے رہنے کے بعد میں اٹھی اور آئینے میں خود کو دیکھنا چاہا۔ میری چیخ نکلی گئی۔ میرے گال سے چربی باہر نکلی ہوئی تھی۔ آنکھ تک جلد جھلس چکی تھی۔ رورو کے میرا گلہ بند نہ گیا۔ دن چڑھے تک میں بھوکی پیاسی، بخار میں جلتی، درد سے تڑپتی اکیلی پڑی رہی۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کیا۔

زریاب کے آنے میں ابھی کئی دن تھے۔ اتنے دن تک میں یوں بے یار و مددگار نہیں رہ سکتی تھی میں جانتی تھی اس سنگلاخ حویلی میں کوئی ایسا نہیں جسے میں اپنا کہہ سکوں، کوئی میری تکلیف بانٹنے نہیں آئے گا۔ کوئی مجھے سنبھالنے نہیں آئے گا، اس طرز تو میں ختم ہو چکی تھی جب کہ مجھے زندہ رہنا تھا مقدس کے لیے زریاب کے لیے، مجھے خود اپنے لیے کچھ کرنا تھا۔ زریاب نے مجھے اکیلا جان کے میرے ساتھ یہ ستم ڈھایا۔ بی بی جان مجھے لاوارث سمجھ کے یہاں مرنے چھوڑ گئیں، لیکن میں ان سب کو بتا دوں گی کہ میں لاوارث نہیں..... بے یار و مددگار نہیں۔

مجھے فیروز لالہ یاد آئے اور ان کا عہد بھی میرے اندر ایک توانائی سی بھر گئی۔ میں نے اپنے زخم کو مرہم سے ڈھانپا۔ گرم دودھ منگوا کے پیا۔ ذرا بہت آ جانے پہ سرحدی کی مدد سے مردان خانے جا کے فیروز لالہ کو فون کیا۔ میری سسکیاں انہیں احساس دلائیں کہ بات غیر معمولی ہے اس لیے تین گھنٹے میں ہی وہ میرے پاس موجود تھے۔ میری حالت دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے۔

”مومنہ..... تم..... یہ سب کیسے ہوا؟“ وہ گمان بھی نہ کر پائے کہ یہ سب کس نے کیا ہوگا اور جب میں نے خود پہ پڑنے والی افتاد کا ذکر کیا تو وہ چند لمحے بے یقینی سے بیٹھے رہے پھر ان کی آنکھیں غیرت کے مارے لہورنگ ہو گئیں۔

”اس گھر میں فیروز خان وردگ کی بہن پہ اتنا گھٹیا الزامات لگائے گئے۔ کیا یہی سب وہ خوشیاں تھیں جنہیں دکھانے کا وعدہ کر کے زریاب تمہیں یہاں لایا تھا۔ وہ میرا دوست ہے لیکن اب میں بھول جاؤں گا کہ وہ میری بہن کا شوہر ہونے کے علاوہ اور بھی کوئی رشتہ رکھتا ہے اسے اس رشتے کے تمام تقاضے پورے کرنا ہوں گے۔“

”نہیں لالہ زریاب کا کوئی قصور نہیں وہ کچھ نہیں جانتے، وہ تو جب مجھے اس حالت میں دیکھیں گے تو نجانے کیسا محسوس کریں گے۔ یہ سب ہوائی ان کی غیر موجودگی کی وجہ سے ہے۔ اگر وہ یہاں ہوتے تو کس کی مجال تھی مجھے ہاتھ لگانے کی، میری چادر کھینچنے کی، مجھ پہ گندے الزامات لگانے کی۔“

”ٹھیک ہے وہ تمہارا شوہر ہے، تمہارا سہیل، لیکن باقی افراد سے بھی تمہارا کوئی نہ کوئی رشتہ ہے۔ سب پہ تمہاری حرمت فرض ہے۔ شوہر کی غیر موجودگی میں تمہارا بے سہیلان اور غیر محفوظ ہونا ثابت کرتا ہے کہ زریاب تمہیں یہاں تمہاری شان و شوکت نہیں دلا سکا۔ میں بات کرتا ہوں باچا جان سے، وہ خود چل کے آئے تھے، ہمیں بیاہنے تمہارے والی ہیں تمہارے سر پرست۔“

وہ میرا ہاتھ تمام کے باچا جان کے کمرے میں لے گئے۔ بستر پہ نیم دراز باچا جان سنبھل کے بیٹھ گئے۔

”السلام علیکم باچا جان“ فیروز لالہ نے غصے کی آخری حد میں میں تعظیم یاد رکھی۔

”آؤ فیروز آؤ۔“ انہوں نے درز دیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے فیروز لالہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شاید انہیں میرا یوں کمرے میں گھسے چلے آنا پسند نہیں آیا تھا۔ اب تک ان کی کسی بہو کو اتنی جسارت نہ ہوئی تھی کہ وہ بلا اجازت ان کی بلائی میں داخل ہوتی۔

”باچا جان میں صرف آپ سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ کیا خٹک خاندان میں عورت کی عزت صرف ماں، بہن اور بیٹی کے رشتے کے حوالے سے کی جاتی ہے؟ کیا بیٹے کی عزت گھرانے کی عزت نہیں کہلاتی جاتی اور کیا بہو کو بیٹی والی تعظیم نہیں مل سکتی۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو فیروز۔“ باچا جان کے لہجے سے ناگواری جھلک اٹھی۔

”صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں باچا جان“ اس نے میرے چہرے سے چادر سر کا کے مجھے آگے کیا۔ باچا جان میرے چہرے پہ یہ گہرا نشان دیکھ کے حیرت زدہ رہ گئے۔

”یہ سب کیسے ہوا اور کب؟“

”آپ یہ پوچھیے باچا جان کہ یہ سب کس نے کیا اور کیوں؟ اس لیے کہ یہ نشانات

حادثاتی نہیں ہیں۔ آپ کی صاحبزادی نے ناصرف اپنی بھابی پہ جسمانی تشدد کیا ہے بلکہ نہایت بے رحمی سے رکیک ترین الزامات بھی لگائے ہیں جو اس خاندان کی بہو کے حوالے سے مومنہ کے لیے انتہائی شرمناک ہیں۔“

”اس نے کوئی الزام لگائے ہیں نہ ہی تشدد کیا ہے۔“ بی بی جان کمرے میں چلی آئیں۔

”تند بھانج کے جھگڑے کس خاندان میں نہیں ہوتے۔ بس کل بات ذرا زیادہ ہی بڑھ گئی اور وہ بھی سب اس کی وجہ سے ہوا۔ یہ پہاڑوں کی رہنے والی زبان دراز گنوارن، خاندانی طور اطوار کیا جانے۔ اس کی زبان..... توبہ توبہ..... زرسا نگہ بھی مشتعل ہو گئی۔“

”یہ محض تند بھانج کا جھگڑا نہیں تھا بی بی جان۔ بلکہ یہ جھگڑا ہی نہیں تھا۔ جھگڑا دو طرفہ ہوتا ہے۔ یہ تو زیادتی تھی جو آپ کی بیٹی کی طرف سے ہوئی ہے۔ ظلم ہے جو اس نے میری بہن پہ توڑا ہے، وہ جھوٹ نہیں کہہ رہی ہے۔“

”تو کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں؟“ بی بی جان کو جلال آ گیا۔ فیروز لالہ نے نظریں جھکا لیں۔ آپ میری بزرگ ہیں میں آپ کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کرنا چاہتا لیکن خدا کے لیے اپنی بزرگی کا مان رکھ لیں۔“

”سچ کیا ہے حضرتی؟“ باچا جان گرجے بی بی جان نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن کچھ کہنے کے لیے نہ لگیں۔ سچ کہنے کی ہمت نہ تھی اور جھوٹ وہ اپنے خانہ جی کے سامنے بول نہیں سکتی تھیں۔

”زرسا نگہ کہاں ہے؟“ وہ بولے۔

”وہ چاری تو کھانا سے بیمار پڑی ہے۔ اپنی سدھ بدھ ہی نہیں اسے۔ میں نے کہا ہاں عورتوں کی لڑائی تھی، زبانی کلامی طعنوں سے بات اس عورت نے آگے بڑھائی، زرسا نگہ کو مارنے کے لیے آگے بڑھی تو اس نے اپنے بچاؤ کے لیے اسے دھکا دے دیا۔ غلطی سے آگے یہ جا پڑی۔ وہ بے چاری تو خود دہشت اور خوف کے مارے بیمار ہو گئی ہے۔“ انہوں نے جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ بات بنائی۔ باچا جان کی آنکھوں میں بے یقینی دیکھ کے میں نے کہا۔

”باچا جان ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میرا یقین کیجئے ان پہ ہاتھ اٹھانا تو دور کی بات میں تو ان کا اٹھا ہاتھ روکنے کی جسارت بھی نہیں کر پائی۔ سارا گھر گواہ ہے انہوں نے..... میرے ساتھ..... میں سسک اٹھی۔

”مجھے طمانچے، لاتیں، گھونے مارے، گالیاں بددعائیں دیں۔ گندے الزامات لگائے، جلتی لکڑی میرے چہرے پہ رکھ دی۔ میں سچ کہہ رہی ہوں باچا جان میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے اللہ رسول کی قسم، میرا کوئی قصور نہیں۔“

”تو کیا اور تیری قسم کیا۔ جب اللہ رسول پہ تیرا ایمان ہی نہیں تو قسم کیوں اٹھاتی ہے۔ تو تو قسم اٹھا کسی بت کی، کسی سانپ کی، سورج کی، جن چیزوں کو پوجتے ہو تم کافر لوگ۔“ بی بی جان کے اس طعنے پہ فیروز لالہ بھڑ گیا۔

”باچا جان، یہ آخری حد ہے، آپ خود اندازہ لگالیں اس گھر میں اس کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہوگا۔ یہاں نہ اس کے کردار کا احترام کیا جاتا ہے نہ ایمان کا۔ جب میں نے اسے رخصت کیا تھا تو آپ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ آپ کے گھر میں اس کا پرانا حوالہ کوئی یاد نہیں رکھے گا۔ یہ وردگ حویلی سے رخصت ہو رہی ہے، وردگ خاندان سے خشک خاندان تک جاری ہے میں نے اپنا نام اس کے نام کے آگے لگا کے اسے آپ کے حوالے کیا تھا۔ بی بی جان نے اسے نہیں مجھے گالی دی ہے میرے خاندان کو دی ہے۔“

”خاندان خون سے ہوتا ہے، نسب سے ہوتا ہے فیروز تم بھی پٹھان ہو، ہم بھی پٹھان ہیں۔ یہ بات تو جانتے ہو گے نسلیں اپنا خون پیچتی ہیں تو نام کے آگے کوئی حوالہ لگتا ہے۔ میں ان رشتوں کو نہیں مانتی۔ زبانی کلامی کہہ دینے سے کوئی بہن ہو جاتی ہے نہ بھائی بن جاتا ہے۔“

”بی بی جان میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ باچا جان سے اجازت لینے آیا ہوں کہ مومنہ کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اب زریاب آئے گا تو ہی کوئی فیصلہ ہوگا۔ ابھی باچا جان کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ بی بی جان کہہ اٹھیں۔“

”یہ کہیں نہیں جائے گی۔“

”کیوں نہیں جائے گی۔ اس کی حالت دیکھیں۔ یہ کمزور ہے، بیمار ہے، زخمی ہے۔ اسے کس کے سہارے چھوڑ کے جاؤں میں۔ آخر آپ کی بیٹی بھی تو کافی عرصے سے یہاں رہ رہی ہے۔“

”یہ اس کے باپ کا گھر ہے۔“

”مومنہ بھی اپنے بھائی کے گھر جا رہی ہے۔“

”وہ اپنے شوہر کے ساتھ، اس کی اجازت سے یہاں آئی ہے۔“

”میں بھی باچا جان سے اجازت ہی طلب کر رہا ہوں۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں مومنہ سے یہ ضرور کہتا چاہوں گا کہ زریاب کے

آنے میں چند ہی دن رہ گئے ہیں۔ بلکہ میں اسے جلد از جلد بلوانے کی کوشش کروں گا۔ بہتر ہوگا کہ تم یہیں رک کے اس کا انتظار کرو۔“ میں تذبذب کا شکار تھی میری ہچکچاہٹ دیکھ کے بی بی جان نے ہنسی ابدلا۔

”شوہر کی غیر موجودگی میں قدم باہر دھرنے والی عورتیں بااعتماد نہیں ہوتیں۔ پھر بھی اگر جانا چاہو تو یاد رکھو بچی میں تمہیں نہیں لے جانے دوں گی۔ تم پہ تمہارے اس نام نہاد بھائی کا اختیار چل سکتا ہوگا۔ خشک خاندان کی بیٹی پہ وہ کوئی حق نہیں جما سکتا۔“ بی بی جان کا خیال ہوگا بچی کے بغیر میں جانے کا فیصلہ نہیں کر پاؤں گی، اور شاید ایسا ہی کرتی میں، لیکن فیروز لالہ نے اصرار کیا۔

”مومنہ میری بات مان لو یہاں تمہاری عزت اور جان دونوں غیر محفوظ ہیں۔ تمہیں اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے زندہ رہنا ہے، ورنہ سچ کو دبانے کے لیے یہ لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“ اس تہرے پہ اب تک محل سے بیٹھے باچا جان بھی بھڑک اٹھے۔

”فیروز خان تم بے ادبی کے مرتکب ہو رہے ہو،“ میں اور بھی خوفزدہ ہو گئی۔

”ہمت کرو مومنہ، بچی ان کا اپنا خون ہے اسے یہاں کوئی خطرہ نہیں اگر یہ رکھنا چاہتے ہیں تو رکھنے دو چند دن کی بات ہے۔ زریاب سے رابطہ کر کے میں اسے فوراً واپس بلا تاؤں۔ میرے گھر پہ ہی ساری بات ہوگی۔ تم تیاری کرو۔ یہاں رہو گی تو یا تو پاگل ہو جاؤ گی یا مار دی جاؤ گی۔“ میں نے اک نظر باچا جان اور بی بی جان کے جلالی چہرے دیکھے، میرے رخسار سے ٹیسس اٹھنے لگیں۔ میں نے فیروز لالہ کو دیکھ کے اثبات میں سر ہلایا۔

”مومنہ! یہاں سے چھوڑ دے پھر اسے اٹھائے اور مقدس کو پیار کر کے باچا جان کے پاس رخصت کر دے۔“ دونوں نے ہنسی پھیر لیا۔

”تمہیں عزت کی بڑی خواہش ہے اور خود تم اس گھر کی عزت روند کے جا رہی ہو۔ اس شخص کے ساتھ جو تمہارے ساس سر دونوں کی بے عزتی کر گیا تمہارے سامنے اور یاد رکھو تم اس گھر سے بغیر کسی رضامندی کے جا رہی ہو۔ نتائج کی ذمہ دار بھی تم ہی ہوگی۔“

باچا جان نے سرد لہجے میں کہا اور میں..... میں چلی گئی۔

مومنہ خاموش ہو گئی تھی لیکن مقدس کو ایک ننھی سی بچی کے رونے کی آوازیں اب تک آرہی تھیں۔

☆☆☆

”بی بی جان میں شکستہ ہو چکا ہوں کچھ تاب لانے کی مجھ میں مزید ہمت نہیں نہ ہی دل اب اور کوئی گھاؤ سہہ سکتا ہے۔ مجھے مزید مت الجھائیں۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔“

جو کہتا ہے صاف صاف کہیں۔“

زریاب نے بے بسی کی آخری انتہا پہ پہنچ کے بی بی جان کے گھٹنے تھام کے فریاد کی جو باچا جان کی ہتھی نگاہوں سے ہار مان کے عرصے سے سینے میں دبا رکھولنے پہ آمادہ تھیں۔ انہوں نے زریاب کے ہاتھ اپنے پہلو سے اٹھائے، لبوں سے لگا کے کہنے لگیں۔
”زریاب مجھے معاف کر دینا۔ میں خان جی کے سامنے، اپنے بیٹوں کے سامنے تم سے معافی مانگتی ہوں اور یہ اعتراف کرتی ہوں کہ ممتا کی کسوٹی پہ میں کھری نہ اتر سکی۔ ایک کمزور لہجے نے مجھے سکے اور سوتیلے رشتوں میں ڈنڈی مارنے پہ اکسا دیا۔ میری ذرا سی لغزش نے کئی زندگیاں برباد کر دیں۔ مجھے معاف کر دو میں تمہاری گناہ گار ہوں۔“

”بی بی جان!.....“ وہ بے یقینی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جھنجھلاہٹ اس کے چہرے سے ہو رہی تھی۔

”میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔ خدا را مجھے اور یہ بات سنائیں۔ کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟
کن کمزور لمحوں کی بات کر رہی ہیں؟“

”یہ لمحے میری بیٹی زریاب کی زندگی سے میری زندگی تک نقب لگا کے چلے آئے تھے۔ تم جانتے ہی ہو تمہاری بہن کی وجہ سے میں کتنی پریشان رہتی تھی۔ تیس سال سے اوپر ہونے کے بعد بھی اس کی شادی نہ ہو پا رہی تھی۔ شکل و صورت بھی اس کی واجبی تھی اور تعلیم بھی برائے نام تھی۔ اگرچہ خٹک خاندان کی بیٹی کے لیے اس کے خاندان کا نام بھی بہت ہوتا ہے، صورت وغیرہ تو بعد کی باتیں ہیں لیکن اس کی قسمت کہ خاندان میں اس کے جوڑ کا کوئی مرد نہ تھا۔ اور خاندان سے باہر لڑکیاں بیانیے کا ہمارا رواج نہیں تھا۔ ایسے میں بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ تنہائی، محرومی اور مایوسی نے اسے کس توڑ پہ پہنچا دیا۔ میں نے اسے اپنے بہن پہ دباؤ ڈالنے کے لیے کہا جس کا بیٹا رحیم گل ہماری زر سے چندرہ سال چھوٹا تھا۔ مجھے کچھ تامل تھا لیکن خان جی کے پیہم اصرار پہ میں بہن سے فریاد کر بیٹھی۔ میری محبت میں اس نے کسی طرح بیٹے کو منائی لیا یوں بھی سترہ اٹھارہ سالہ لڑکا ابھی اتنا خود سر کہاں ہوا تھا کہ احتجاج کر پاتا ماں باپ کے سامنے۔ لیکن اپنی ساری تلخی اس نے بیوی پہ نکالنا شروع کر دی۔

زریاب کوئی کم عمر لڑکا تو نہیں تھی کہ شوہر سے دب جاتی پھر شوہر بھی وہ جسے چند سال پہلے تک وہ گود میں کھلاتی رہی ہو۔ اس نے بھی رحیم گل سے الجھنا شروع کر دیا۔ اگرچہ یہ ہماری برادری کا پہلا واقعہ نہیں تھا اس سے پہلے بھی کئی بے جوڑ رشتے ہو چکے تھے اور برے

بھلے نبھ بھی چکے تھے لیکن اب وقت بدل رہا تھا۔ تعلیم اور شعور نے ذہن تبدیل کر دیا تھا۔ نہ تو رحیم گل کرخت مزاج کی عمر کی بیوی کو ذہن تسلیم کر سکا نہ ہی زریاب کے خوابوں کو تعبیر ملی اکھڑے اکھڑے رہنے والے کم عمر شوہر سے، رحیم گل کے ساتھ نے اس کی رہی سہی خود اعتمادی بھی چھین لی۔ وہ احساس کمتری کا شکار ہو گئی اور ستم یہ کہ رحیم گل کا رویہ اس کے احساس کمتری کو دیوانگی میں بدلنے میں مددگار ثابت ہونے لگا۔ وہ اس کے سنگھار پہ تنقید کرتا، اس کی عمر اور شکل پہ بے رحمانہ تبصرے کرتا، اپنی مظلومیت کا رونا روتا اور اس کی کم علمی اور بد زبانی کو کوستا۔ زریاب کو ہمیشہ یہ سب مجھ سے بیان کرتے ہوئے بلک پڑتی۔

”بی بی جان! باچا جان نے کیوں تو بردستی مجھے اس کے سر منڈھا۔ میں ان چابی ہستی کی طرح اس کے اوپر مسلط نہیں رہنا چاہتی۔ لوگ اسے رحم آمیز نظروں سے دیکھتے ہیں اور مجھے ایسے جیسے میں کوئی جاوگر نی ہوں جس نے ایک شہزادے کو اپنی قید میں کر رکھا ہے۔
بی بی جان! مجھے محرم ہی رہنا تھا تو خٹک ہاؤس کے ہی کسی کو نے میں رکھ دیتے۔ غیروں کے حوالے کرنے کی کیا ضرورت تھی اور وہ بھی اتنا گر کے، خالہ جی اب اٹھتے بیٹھتے جتاتی ہیں کہ بہن کے بہکاوے میں آ کے بیٹا ناقدروں میں رول دیا۔ ان کی بیٹیاں ماں کو نکالتی ہیں کہ ہمدردی اور ترس کے نام پہ اکلوتے بیٹے کے لیے اماں اٹھالائی ہو۔“

”صبر کرو زرے صبر۔“ میں اور کیا کہتی۔ ”وقت کے ساتھ ساتھ سب صحیح ہو جائے گا۔“
”میں نہیں بی بی جان آنے والا وقت اور بھی تباہی لانے والا ہے۔ ابھی رحیم گل کم عمر ہے۔ باپ کے زور اثر ہے، پڑھ رہا ہے وقت کے ساتھ ملنے والے اختیارات اسے خود مختار بنادیں گے ابھی وہ مجبوری کے ساتھ مجھ سے نباہ رہا ہے۔ کل کو شاید۔“

”اچھا بول منہ سے نکال زرے۔ تو ماں بننے والی ہے اچھی باتیں سوچا کر۔ آنے والی اولاد اتیری قسمت کھول دے گی۔“ لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ اولاد اس کی قسمت میں اور اندھیرے لکھ لائے گی، شتاور جن دنوں پیدا ہونے والی تھی، زرے یہ نہیں تھی۔

”مجھے تم مومنہ کو بیاہ لائے۔ یہ واقعہ اس کی ازدواجی زندگی میں نئی تلخی گھول گیا۔ رحیم گل تمہیں اتنی آزادی کے ساتھ من چاہی بیوی ملنے پر رشک و حسد کا شکار ہو گیا۔ اس کا نشانہ بچاری زریاب کی ہوتی۔“

”من مانیاں کرنا تم لوگوں کا پیدائشی حق ہے، ہے ناں؟ بیٹی کو خود سے آدمی عمر کا خوب صورت لڑکا چاہیے تھا، ماں بھیک مانگ کے لے آئی۔ بیٹے کو جنگلی پھول پسند آیا۔ باپ میلوں چل کے توڑ لایا اور کچھ لوگ مجھ جیسے بد قسمت ہوتے ہیں۔ جن کی ڈور سدا

دوسروں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔“

”لالہ کی شادی کا ذکر کیوں بار بار کرتے ہیں آپ؟ اگر انہوں نے پسند کی شادی کی ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟“

”اور میرا قصور کیا تھا جسے اطاعت اور فرماں برداری کے سبق سکھائے گئے۔ جب میری ماں نے کہا کہ رحیم گل کو اس رشتے پہ اعتراض ہے تو تمہارے والدین نے میرے گھر آ کے میرے ماں باپ کو پٹی پڑھائی کہ بیٹے کی مرضی کیا چیز ہے۔ اصل بات خاندانی ناموس کی ہے۔ خاندان کے بیٹے ہی خاندان کی عزت نہیں ڈھانپیں گے تو کیا باہر سے لوگ آئیں گے مجھے ہر طرح سے مجبور کر کے قربانی کا بکرا بنا دیا گیا۔ زریاب کو کھلی چھٹی کس نے دی؟ تمہارے باپ نے ہی۔ اب کیوں برادری کی کوئی روایت بھاری کنواری نظر نہ آئی؟ اس کے یہ طعنے روز کا معمول بن گئے۔ زریاب نے انہیں دونوں سے تھی۔ اس حالت میں عورت ویسے ہی زور دینے اور حساس ہوتی ہے۔ رحیم گل نے اسے جلا جلا کے اور بھی ادھ موا کر دیا تھا۔ وہ سنگ باری کر کے چلا جاتا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مومنہ پہ توجہ کرنے پہ مجبور ہو جاتی۔ تمہاری محبت نے اس کی گچی سہاگنوں والا روپ چڑھایا تھا۔ اس کے جھل مل کرتے چہرے اور قل قل کرتی ہنسی۔ وہ دل پہ زخمی بن کے گئی۔ وہ تم دونوں کو دیکھ کے کھسنے لگتی۔ تمہارے قہقہے اس کے اپنے لوحوں پہ ہنستے معلوم ہوتے۔ اپنی ناخوشگوار اور غیر متوازن زندگی کا قلق اسے رہنے لگا۔“

ایسی ہی عجیب ذہنی و جذباتی کیفیت میں اس نے اپنے شہناور کو جنم دیا۔ کنواری سحت کی وجہ سے اس کا چڑچڑاپن عروج پہ پہنچ گیا۔ کسی کی ذرا سی بات بھی اسے مشتعل کر دیتی۔ رحیم گل ہر ہنسنے آتا اس کی حالت میں مزید ابتری پیدا کر کے چلا جاتا اور وہ بھی بے بسی کا اظہار پٹکی اور ملازماؤں پہ نکالا کرتی۔ رفتہ رفتہ مومنہ بھی اس کا نشانہ بننے لگی، پھر مومنہ کے بعد جب تم کا رد باری دورے پہ گئے تو ایک بار پھر رحیم گل آیا۔ اسے اس کی ماں نے زر سانگہ کو لانے کے لیے بھیجا تھا۔ بیوی کی حالت دیکھ کے وہ اور چڑ گیا حالانکہ یہ حالت سراسر اس کی دین تھی۔ زہنگی کے بعد افسردگی اور زندگی سے بیزاری نے اسے صحت کی جانب لوٹنے ہی نہ دیا تھا۔ اندر ہی اندر کڑھ کڑھ کے اس کا سارا خون جل گیا تھا۔ چہرے پہ جھانیاں پڑ چکی تھیں، آنکھیں زرد اور ہاتھ چیرے جان۔

”اس لاش کو لانے بھیجا ہے ماں نے ساری عورتیں ہی اولاد پیدا کرتی ہیں۔ تم نے نرالی تو نہیں کی جو چھ مہینے سے بستر سنبھالے پڑی ہو۔ اولاد کے بعد تو عورت کے چہرے

پہ نور آ جاتا ہے، تمہارے چہرے کی تو رہی سہی رونق بھی غائب ہو گئی ہے۔ اپنی بھانج کو دیکھو۔ گلاب کھل رہے ہیں چہرے پہ۔“

”تو جاؤ سو گدھ لو، وہ تو جنگلی پھول ہے ناں بقول تمہارے۔ جنگلی سو غنائیں سب کے لیے ہوتی ہیں تم بھی حزا لے لو۔“

”شٹ اپ بد تمیز عورت کچھ تو لحاظ کرو تمہارے چھوٹے بھائی کی بیوی ہے وہ۔“

”تم کیوں نہیں رشتوں کا لحاظ کرتے جب اس کے حسن کے قصیدے پڑھتے ہو۔“

”کون سا قصیدہ پڑھا ہے میں نے! تم تو مفت میں بدنام کرنے والی عورت ہو،

تمہارے سائے سے بھی دور رہنا چاہیے۔ منحوس بڑھیا۔“ وہ زہر تھوک کے چلا گیا اور

کھلے ساری رات ان کڑوے الفاظ کی مار سکتی رہی لیکن کمزور اعصاب کی عورت اتنا سب

سہہ نہ کی۔ جب اس کے اندر لاوا پک کے تیار ہو گیا تو وہ کمرے سے نکل اسے پتا چلا کہ

مہمان خانے میں رحیم گل کے ساتھ مومنہ بھی موجود ہے تو جیسے آتش فشاں پھٹ گیا۔ اتنے

دلوں سے اس کے اندر بھیج اس ایک دم ہی نکل گئی اس نے مومنہ اور اپنے شوہر کے

حوالے سے کچھ ایسی باتیں کہیں کہ وہ بھی غصے سے باہر نکل گیا اور مومنہ بھی ضبط نہ کر سکی

اس کے منہ سے جواب سن کر زریاب سا نگہ بالکل ہی دیوانی ہو گئی اس نے..... اس نے تمہاری

بیوی پر ہاتھ اٹھایا۔ میں نے..... زریاب نے، سرحدی نے سب نے اسے قابو کرنے کی بہت

کوشش کی لیکن وہ ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ جیسے کوئی جن اس پہ قابض ہو گیا تھا اتنی

طاقت اس کے اندر بھر گئی تھی، عجیب سی وحشت اس کے چہرے سے فٹک رہی تھی، میں

خود وہ ہو گئی وہ باہر لاوا کو چھڑا لیتی اور مومنہ پہ پل پڑتی، ہاتھوں، پیروں کے بے دریغ

استعمال کے ساتھ اور پھر..... میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آتش دان سے لکڑی نکالی

اور..... مومنہ کا چہرہ داغ دیا۔“

زریاب دم بخود بیٹھا رہ گیا۔ دراب اور افراسیاب کے چہروں پہ بھی استعجاب تھا

جب کہ بی بی جان نے ایک بار بھی نہ نظر اٹھائی نہ چہرہ۔ ان کے جھکے چہرے سے آنسو

فٹک فٹک کے گود میں رکھے ہاتھوں پہ پڑنے لگے۔

زریاب کے تصور میں مومنہ کا بے داغ ہشتا ہوا چہرے آیا اور شعلے..... اس نے

کرب سے آنکھیں موند لیں۔

”میں مانتی ہوں مجھے صورت حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے مومنہ کی

دلجوئی کرنا چاہیے تھی اگر میں اس وقت اسے سنبھال لیتی تو شاید حالات اتنے خراب نہ

ہوتے لیکن زرسا نگہ کی کیفیت نے میرے ہاتھ پاؤں پھلاد دیے۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی اور ڈاکٹر کے مطابق اگر یہ کچھ دیر اور ہوش میں رہتی تو اس کی دماغ کی شریان کا پھٹنا یقینی تھا۔ دوسری طرف غم و غصے اور بے بسی کا شکار مومنہ نے میری لاعلمی میں فیروز کو مدد کے لیے طلب کر لیا۔ خان جی اب تک سارے قصے سے انجان تھے۔ لیکن اب ان کے ساتھ ساتھ سارے گھر کو علم ہونے والا تھا کہ زرسا نگہ سے کیا حرکت سرزد ہوئی ہے۔ جب اسے ہوش آنے پہ علم ہوا کہ فیروز مومنہ کے ساتھ خان جی کے کمرے میں ہے اور زریاب کو بلوانے کا فیصلہ ہو رہا ہے تو وہ سر اسیمہ ہو گئی۔ میرے پیر پکڑ کے منت کرنے لگی۔

”بی بی جان زریاب کو کچھ بتا نہ چلے۔ وہ پاگل ہو جائے گا اپنی بیوی کا چہرہ دیکھ کے وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔“

”اسے تو پتا چل ہی جائے گا نرے۔ مومنہ کا چہرہ خود بخود بتا دے گا۔ یہ تو نے کیا بد نصیب۔“ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اسے کوہنٹے ہوئے۔

”رحیم گل پہلے ہی مجھے بسانا نہیں چاہتا اب مجھ پہ پاگل پن کا الزام لگا کے مجھے رسوا کر دے گا بھائی کی نظروں سے بھی گرے گا میں کہاں جاؤں گی۔ میں تو ہر طرف سے بے وقعت ہو جاؤں گی بی بی جان۔“ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

”یہ تو پہلے سوچنا تھا۔ اب کیا ہو سکتا ہے بات میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی جب تو آگ اٹھا کے اس پہ پکی تھی۔ زریاب کی چیخ کا منہ جلادیا تو نے..... وہ تو اک پل یہاں نہ رہے گا اب۔“

”کچھ کرو بی بی جان، کچھ کرو زریاب کے آگے پہلے پہلے کچھ ایسا کرو کہ میں بچ جاؤں، دنیا مجھے جینے نہیں دے گی۔ میرا کوئی ٹھکانہ نہ رہے گا۔ میرا ال والے پاگل کہہ کے ٹھکرائیں گے تو بھائی بھی نفرت کریں گے۔ مجھے بچالو..... زریاب کو کچھ بتا دینے دو۔ مومنہ کے پاؤں پکڑ کے منت کر لوں گی میں، اسے کسی طرح جانے سے روک دو میں اس سے معافی کی بھیک مانگوں گی، کہوں گی میرا نام وہ مت لے۔“

”اور اگر وہ نہ مانی تو؟“

”تو..... تو پھر میں اسے ملدوں گی..... جب میں اس کا چہرہ جلا سکتی ہوں تو پورے کا پورا بھی بھسم کر سکتی ہوں۔ وہ نہ رہے گی تو کون بتائے گا زریاب کو، کیسے پتا چلے گا رحیم گل کو۔“ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھر چڑھ گئیں اور ہاتھ پیر مڑنے لگے۔ گردن کو خفیف سے جھٹکے لگنے شروع ہو گئے۔

میں ہار گئی..... ممتا کے ہاتھوں..... ساری عمر پلڑا سلامت رکھا..... ایک لمحہ ایسا نہ آیا اتنے سالوں میں کہ تم میں اور افراسیاب میں دراب اور زرسا نگہ کے مقابلے فرق برتا ہو، لیکن اس وقت..... لیکن نہیں..... شاید زرے کے بجائے میری کوئی اور بھی اولاد ہوتی تو میں یہی کرتی..... چاہے تم ہوتے چاہے دراب..... جب کسی ایک اولاد کی جان پہ بن آئے تو ماں سب کر گزرتی ہے میں نے سوچا تمہاری ہادی شدہ زندگی میری بیٹی کی جان سے قیمتی تو نہیں ہوگی۔ بیٹا سلامت تو ہوئیں اور مل جائیں گی اپنی لاڈلی کہاں سے لاؤں گی۔ میں کیا جانتی تھی میں تو سب کچھ گنوانے جا رہی تھی سب کچھ۔

میری ہر کوشش کے باوجود فیروز مومنہ کو لے گیا خان جی مومنہ کے ساتھ ہونے والے سلوک سے ناخوش تھے لیکن فیروز کے اشتعال انگیز جملے انہیں بھی ناگوار گزر رہے ہیں۔ فیروز کے فائدہ اٹھا کے انہیں اور دہرایا اور ایک منصوبہ تیار کر لیا۔ میں جانتی تھی فیروز کے بلائے ہوئے زریاب فوراً چلا آئے گا۔ اور پھر۔ مومنہ کی زبانی سب کچھ سن کر..... یہی تو میں نہیں چاہتی تھی کہ ساتھ ساتھ مجھے بیٹا بھی ہاتھ سے جاتا دکھائی دے رہا تھا میں نے زریاب کو خان جی کی بیماری کی اطلاع دے کر فوراً آنے کو کہا۔ میرا پیغام جب اسے ملا تب تک تو فیروز اب کمر بھی نہ پہنچا ہوگا۔ زریاب اطلاع ملتے ہی وہاں سے روانہ ہو گیا اس طرح فیروز سے ان کا رابطہ نہ ہو سکا۔ تیسرے دن جب..... بی بی جان نے کہتے کہتے سر اٹھایا، کمرے میں موجود تمام نفوس پہ ایک نظر ڈالی، پھر ان کی نگاہیں گم صم پیٹھے زریاب پہ جم گئیں۔

”تیسرے دن..... تم آئے تو میں حواس باختہ ہو گئی۔ خان جی کا غصہ کم ہو چکا تھا۔ وہ میری چال میں شریک ہونے سے انکاری تھے بلکہ انہوں نے مجھے سختی سے باز رہنے کا حکم دیا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا میں نے اپنی عمر بھر کی وفاؤں اور خدمتوں کے بدلے ان سے یہ گستاخی کا حق مانگ لیا انہیں اللہ اور رسول کے واسطے دیے، اولاد کی قسمیں دے کر مجبور کر دیا۔ وہ چپ کر گئے اور میں نے تمہیں.....“

ان کی آواز لڑکھڑائی تو زریاب نے ہاتھ کھڑا کر کے انہیں خاموش رہنے کی استدعا کی۔ وہ جانتا تھا آگے کیا ہوا۔ بوجھل قدموں کے ساتھ وہ دائیں طرف موجود بڑی سی کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔

شفیق کی لالی حد نگاہ تک خون کی لکیر کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے کانوں میں بی بی جان کے سالوں پہلے کہے بے رحم الفاظ کی بازگشت سنائی دی۔

”میں نہ کہتی تھی زریاب، نسب کے بغیر اصول کچھ نہیں ہوتا۔ جنگل کے پھول جنگلوں میں ہی رہ پاتے ہیں۔ تمہاری وہ بیوی چار دن تمہارے بغیر نہ رہ سکی۔ تمہارے جاتے ہی وہ تمہارا دوست فیروز جو خود کو اس کا بھائی بتاتا ہے، تو بہ تو بہ کیسے کیسے رشتوں کو پامال کرتے ہیں یہ بے ہدایت لوگ، وہ روز ہی آجاتا تھا ملنے، اس سے پہلے مجھے اعتراض نہ ہوا پھر لوگ باتیں بنانے لگے آخر کون سا ساگا والا بھائی تھا۔ گھنٹوں کمرے میں بند رہتے تھے۔ میں نے صاف الفاظ میں ٹوکا تو وہ تو کھل کے ہی سامنے آ گئی۔ بے شرمی سے اپنے اور اس کے تعلقات کو تسلیم کرتے ہوئے کہنے لگی میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی، تمہیں اپنا بیٹا مبارک ہو جس نے مجھے یہاں قید کر کے رکھا ہوا ہے۔ میں فیروز کے ساتھ جا رہی ہوں۔ میری تمام تر خوشیاں اسی کے پاس ہیں نامراد بچی تک چھوڑ گئی۔“ وہ چیخ اٹھا تھا۔

”بس کریں بی بی جان، آپ جانتی ہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں کس کے متعلق کہہ رہی ہیں اور کس سے کہہ رہی ہیں۔ اس وقت طیش کے مارے اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ اپنا سر سامنے کی دیوار سے پھوڑ ڈالے، کیونکہ یہ سب باتیں بے دلی اس کی معزز ترین بی بی جان تھیں جن سے بے ادبی کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اس قدر فضول باتیں۔

”پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے زریاب تمہیں لیجن نہیں تو اپنے باپ سے پوچھو، میں تو ساس ہوں ناں اس کی اور تمہاری سوتیلی ماں۔ جھوٹ بھی کہہ سکتی ہوں، اس گھر کے ہر

فرد سے پوچھ لو۔ کس بے شرمی اور بے غیرتی کا مظاہرہ کر کے گئے ہیں تمہارا دوست اور تمہاری بیوی۔ دیکھو خان جی کی حالت اور جا کے دیکھو زرسا نگہ کو۔ کیسے بے سدھ پڑی ہے۔ یہ تماشا بھی تو نبایا تھا اس گھر کے درو دیوار کے لیے۔ میں تو کہتی ہوں میں زندہ ہی کیوں ہوں یہ سب دیکھنے کے بعد شاید تمہاری آنکھوں میں بے اعتداری کے رنگ دکھنا باقی تھے یا شاید تم سے جھوٹا ہونے کا الزام سننا باقی تھا۔

”بے حیا میرے سامنے ہی کتنا گند بک گئی۔ کہنے لگی زریاب جیسے شخص مرد کے ساتھ کوئی عورت چار دن بھی خوش رہ لے تو بڑی بات ہے۔ ہر وقت رنگوں میں گم رہنے والا دیوانہ۔ میں تو فیروز جیسے مرد کے پیچھے مرنی ہوں جسے مرد کہنے میں بھی مزا آتا ہے۔“

بی بی جان کا یہ جملہ زریاب کو بھڑکا دینے کے لیے کافی تھا۔

”موم..... نہ..... وہ چیخا۔“

”میں چھوڑ دوں گا نہیں اس ذلیل عورت کو نہ ہی اس بے غیرت شخص کو۔ میری آنکھوں میں دھول جھونکی دونوں نے۔“ غیرت دغھے سے وہ کپکپانے لگا۔

”دفع کرو مردو دوں کو۔ تین حرف بھیج اس کا فرن پہ، جانے دے جہاں مرضی خوار ہوتی پھرے۔ اس کی منزل یہ گھر تھا ہی نہیں شکر ہے تمہاری بچی محفوظ رہی ہے۔“

”ایسے کیسے دفع کر دوں..... وہ میری مردانگی کو گالی دے گئی ہے، فیروز میری دوستی کا خون کر گیا ہے۔ میں بے غیرتوں کی طرح بیٹھ جاؤں..... نہیں بی بی جان..... میں ان دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ وہ دیوار سے لگی راکفل اٹھا کے باہر لپکا۔

”زریاب..... رک جاؤ۔“ وہ پکاریں باچا جان اٹھتے اٹھتے گر پڑے۔ اچانک ہی فوج نے ان پہ حملہ کر دیا۔ حضرت بی بی نے ایک نظر شوہر کے اٹھتے ہوئے وجود پہ ڈالی دوسری نظر طوفان کی طرح باہر نکلتے کڑیل بیٹے پہ ڈالی۔ پہلی بار انہیں اپنے فیصلے کی سنگینی کا احساس ہوا۔

ہر ویلے تانگاں یار دیاں
میں تان بیٹھی کاگ اڈاواں

وہ دو دن قیامت کے دن تھے۔ کہتے ہیں ناں روز حشر کسی کو کسی کا ہوش نہیں ہوگا۔ وہی حال میرا تھا ان دنوں، فرق صرف یہ تھا کہ مجھے اپنا ہوش نہ تھا..... میری سانسیں ابھرتی تھیں، ڈوبتی تھیں اور ہر سانس کے ساتھ تسبیح کے دانے کی طرح ایک نام سینے میں گر جاتا تھا۔

زریاب.....

میں ہانگوں، دیوانوں کی طرح حویلی کے دروازے تک دن میں کئی چکر لگایا کرتی۔

میرا دل مجھے اس کے آنے کی خبر دیتی اور اسے نہ پا کے مارے جھنجھلاہٹ کے میں شریہ

میں سے لڑ پڑتی۔ آپ بچھاں کہ میں قاصد دیکھاں
میرا گئی گیا حال نماں

فیروز لالہ سے جرح کر کر کے میں نے زچ کر ڈالا۔

مجھے یقین نہ آتا کہ وہ زریاب سے رابطہ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ مجھے لگتا جیسے

مجھ سے کچھ چھپایا جا رہا ہے۔

”کہیں زریاب نے آنے سے انکار تو نہیں کر دیا، کہیں میرا بغیر اجازت گھر سے نکلنا

اسے ناراض تو نہیں کر گیا، کہیں بی بی جان نے اسے بھی تو یہ کہہ کر نہیں ورغلا یا کہ زرسا نگہ سے جھگڑا بڑھانے میں ساری غلطی میری ہے۔“

میری ہر سوچ کی تان انہی خدشوں پہ آ کے ٹوٹ جاتی۔ اس کی ناراضگی کا ہلکا سا

اندیشہ بھی مجھے بے جان کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں آس ہار کے بے دم ہونے لگتی تو کانوں کے پاس کسی کی سرگوشی میرا پھر سے حوصلہ بڑھا دیتی۔

غلام فرید میں تان دوزخ سڑساں
جے میں کھ ماہی ولوں موڑاں

میں ہر خدشے جھٹک دیتی۔

”نہیں نہیں میرا زریاب مجھ سے منہ نہیں موڑ سکتا، وہ مجھ سے خفا نہیں ہو سکتا۔ اس میں اتنا حوصلہ ہی کہاں ہے۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔ پھر وہ آیا کیوں نہیں اب تک؟ میرے ساتھ اتنا کچھ ہو گیا وہ کیسے انجان ہے؟ کیا اسے کسی سے اطلاع ملنے کی ضرورت ہے؟ وہ تو کہتا ہے۔۔۔۔۔ مومنہ تجھے پیاس لگتی ہے تو مجھے پتا چل جاتا ہے۔۔۔۔۔ میں گہری نیند میں محسوس کر لیتا ہوں تو نے کب کروٹ بدلی۔۔۔۔۔ پھر اسے پتا کیسے نہ چلا کہ وہ چہ چہ دیکھ کے اس کی صبح نکھرتی ہے۔۔۔۔۔ اب داغدار ہو چکا ہے۔۔۔۔۔ سگ رہا ہے اس کے پیار بھرے مرہم کبے بے ترس رہا ہے۔۔۔۔۔ زریاب۔۔۔۔۔ زریاب۔۔۔۔۔ کہاں۔۔۔۔۔ ہاں میں سچ سچ دیوانی ہو گئی تھی۔

کملی کر کے چھوڑ دو اے
تے بیٹھی لکھ گھیاں دے رو اس

مجھے نہ بھوک لگتی۔۔۔۔۔ نہ پیاس محسوس ہوتی۔ اپنی ہی پیاس کی ہرک کبھی کبھی بہرین کے پورے وجود پہ چھا جاتی مگر میں ممتا کو تھپک دیتی۔

”صبر۔۔۔۔۔ بس کچھ دیر اور۔۔۔۔۔ وہ آتا ہی ہوگا۔۔۔۔۔ مجھے انصاف دلانے۔۔۔۔۔ وہ تو ہے جو مجھے سب سے زیادہ جانتا ہے۔۔۔۔۔ نہ صرف جانتا ہے بلکہ پتا بھی ہے۔۔۔۔۔ اس کو آجائے پھر میں پوری شان سے وہاں لوٹوں گی، اپنے گھر۔۔۔۔۔ اپنی بچی کے پاس۔۔۔۔۔ اس کو وہ آجائے اس کے بغیر نہیں۔۔۔۔۔ اس کے بغیر میں کیا ہوں۔۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں وہ آئے گا۔۔۔۔۔ میں سر اٹھا کے اس حویلی میں جاؤں گی پھر کس کی مجال ہے جو مجھے میزبانی آنکھ سے بھی دیکھ لے۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ وہ آئے تو سہی۔۔۔۔۔ وہ کیوں نہیں آتا۔۔۔۔۔؟

”خان زریاب آگئے“

میری آنکھیں پتھرا چکی تھیں رستہ دیکھتے دیکھتے جب کسی نے مجھے یہ اطلاع دی تو میری پلک تک نہ جھپک سکی۔

”آ گیا۔۔۔۔۔ زریاب۔۔۔۔۔ آ گیا۔“ میں ننگے پیر اٹھ کے بھاگی۔

”مومنہ۔۔۔۔۔ رکو۔۔۔۔۔ وہ نہیں آئے گا۔“ لالٹی نے پیچھے سے پکار کے مجھے روکنا چاہا۔

”مردانے میں اس وقت نجانے کون کون ہوگا“ ”رک جاؤ۔“

لیکن میں کیسے رکتی، بخار کی حدت سے تپتے میرے ننگے پاؤں ٹھنڈے کپے فرش پہ جھلس جھلس کے پڑ رہے تھے۔ میرے کئی دن کے بکھرے روکھے بے ترتیب بال اور بھی اُبز گئے۔ میرے اس طرح بھاگنے سے بے پروائی سے سر پہ ڈالی چادر بھی نیچے لٹک رہی تھی۔ حجرے کے پاس میرے پاؤں کے انگوٹھے میں چادر کا کونا پھنسا اور میں منہ کے بل دروازے پہ گر گئی، دہلیز پہ ایک اکھڑا ہوا کیل میرے ہونٹ پہ لگا اور دور تک نازک ماس اوچھڑ گیا۔ میں پاؤں سہلاتے ہوئے چادر کا کونا لپیوں پہ رکھ کے خون دبا رہی تھی کہ اندر سے زریاب کی آواز آئی۔

”مومنہ کہاں ہے؟ میری بیوی کہاں ہے؟“

مجھے جھپٹا لگا جیسے اسے دیکھے صدیاں بیت گئی ہوں۔ میرے اندر کی اداسی کو اس کی آواز نے اور پھر کچھ لمحے کے بعد مجھے سے پہلے میں نے درد کی شدت میں دباتے ہوئے بڑے اشتیاق سے ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانکنا چاہا اور۔۔۔۔۔ میں وحک سے رہ گئی۔۔۔۔۔ فیروز لالہ کا گریبان زریاب کی گرفت میں تھا اور اس کی رائفل کا رخ لالہ کے سینے کی جانب۔ اس وقت لالہ کے چہرے پہ بھی جیسی بے یقینی تھی جس نے ایک اکیلی مجھے جکڑ کے بت کر دیا تھا۔

”میں پوچھ رہا ہوں کیا میری بیوی تمہارے پاس ہے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ وہ اندر۔۔۔۔۔ لالہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی زریاب نے اسے ایک زور کا جھٹکا دیا، لالہ کی آنکھیں جوش سے باہر اٹل رہی تھیں وہ مجھے بالکل اجنبی سا محسوس ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ ہاں بالکل اجنبی اتنا اجنبی تو وہ مجھے تب بھی نہ لگا تھا جب میں نے اپنے بچے کی بار دیکھا تھا۔

”مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم اسے زبردستی لائے ہو یا وہ اپنی مرضی سے آئی ہے؟“

”میں کیوں زبردستی کروں گا؟“ کچھ نہ سمجھنے کی کیفیت میں بھی لالہ نے محل سے کام لینے کی پوری پوری کوشش کی۔

”وہ اپنی خوشی سے، اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی ہے۔“ اس کے اتنا کہتے ہی زریاب آپے سے باہر ہو گیا۔ رائفل کے بٹ کے زور پہ اس نے لالہ کو نیچے گرا دیا۔

”بے غیرت کتے“ یہ اعتراف میرے سامنے کرتے ہوئے تجھے ذرا بھی غیرت نہیں آرہی۔۔۔۔۔ اور کہاں ہے۔۔۔۔۔ کہاں ہے وہ ناگن وہ بے حیا۔۔۔۔۔ بے وفا عورت۔۔۔۔۔ کمینہ

نسل کی عورت..... جسے عزت راس نہ آئی..... بلا اسے..... اس کے سامنے میں تیری لاش گراؤں گا..... تیری، جس کے ساتھ وہ اپنی ”خوشی“ اور ”مرضی“ سے آئی ہے اور اسے..... اسے میں یہاں نہیں ماروں گا..... بے وفا ہی کہی ہے تو میری بیوی..... اس کے نام کے آگے میرا نام لگا ہے، اس کی ناپاک لاش میرے ہی گھر میں گرے گی۔ میں اس کا خون بھی کسی غیر زمین پہ بہانا پسند نہیں کرتا..... وہ کیا جھکتی ہے میرے جیتے جی دوسرا یار ڈھونڈ نکالے گی۔“

”زیر..... یاب.....“ آنکھیں پھاڑ کے اس کے زہرا مگھتے لہجے پہ غور کرنے والا فیروز لالہ جیسے کسی خواب سے جاگ کے دھاڑا تھا۔

”زیر یاب..... ہوش میں رہ کے بات کرو.....“ وہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ میں اپنی طرح سنگی مورتی کی طرح جیسے دلیز پہ نصب ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے سے انداز میں انداز بھانپتی رہی۔ مجھے زیر یاب کے ہلاکت میں ڈال دینے والے جیسے بھی پہنچے تھے اور فیروز لالہ اور اس کا ایک دوسرے پر جھپٹنا بھی دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن میں کچھ کرنے کے قابل نہ رہی تھی۔ میرے ہونٹوں سے خون فک کے مٹی میں گر رہا تھا اور پتھرائی ہوئی بے یقین آنکھوں سے بے آواز آنسو اس خون کو پتلا کر کے مٹی میں جذب ہو رہے تھے، مجھے لگ رہا تھا جیسے اب کبھی میں بل سکوں گی نہ ہی بول پاؤں گی۔ چاہے فانی آواز نہ مجھے ہلا کے رکھ دیا اور میرے اس گمان کو توڑ کے رکھ دیا، مگر زنی ٹانگوں پہ اٹھتے ہوئے میں نے آخری بار فیروز لالہ کو خون میں لت پت زمین پہ گرے دیکھا۔

حجرے کے دوسری طرف سے بہت سے بھاگتے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ شاید فائر کی آواز نے ملازمین کو بھی چونکنے پہ مجبور کر دیا۔ میں نے زمین پر گری چادر اٹھائی، اپنے گرد لیٹی اور وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔“

مومنہ خاموش ہو گئی تھی لیکن دروازے کے اس طرف کھڑی مقدس اور دوسری جانب اس کے قریب ہی بیٹھا خوشنود..... دونوں کتنی ہی دیر اس کے دوبارہ بولنے کے منتظر رہے..... لیکن..... مومنہ کے خشک لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے تھے، ننھے ننھے ستارے پروئے ہوئی پلکیں بند ہو گئی تھیں۔ پپٹوں کی ہلکی سی لرزش اس بت میں جان ظاہر کر رہی تھی۔

”پھر.....؟“ خوشنود اگرچہ اس سے پہلے بھی کئی بار اپنے دادا اور تایا سے باپ کی المناک موت کا واقعہ سن چکا تھا لیکن اتنی تفصیل سے سننے کے بعد اور وہ بھی ایسی ہستی کی

زبانی جس نے اسے اپنی آنکھوں سے زندگی سے موت کی جانب جاتے دیکھا تھا، ایک عجیب سی ٹکان اور اداسی محسوس کر رہا تھا۔ ایک طویل سرد آہ بھرنے کے بعد اس نے کافی دیر سے خاموش ساکت لیٹی مومنہ کو مخاطب کیا۔ اس کی پلکوں میں خفیف سی جنبش پیدا ہوئی۔

”پھر.....؟ پھر میں سال..... وہ بیس سال صرف میرے تھے ان بیس سالوں میں اور کوئی نہیں..... نہ زیر یاب..... نہ فیروز لالہ..... نہ مقدس..... نہ کوئی اور..... بس میں ہی..... بلکہ شاید میں بھی کہیں نہیں تھی۔ بس یہ بیس سال تھے..... خالی..... تنہا اکیلے..... بیس سال..... ان کا کیا بتاؤں تمہیں..... تم جاننا چاہتے تھے وہ میں نے بتا دیا ہے وہ بھی صرف اس لیے کہ تم نے فیروز خان وردگ کا بیٹا ہونے کا حق استعمال کرتے ہوئے مجھ سے کہا تھا اور اس کے اور لائی کے مجھ پہ بہت سے قرض ہیں۔“ وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگی، خوشنود نے سہارا دے کے اسے اٹھایا۔

”خوشنود..... اب تمہیں یقین آ گیا کہ تمہارا باپ بے موت ضرور مارا گیا لیکن بالکل بے قصور۔ وہ محبتوں کا لکڑھا آدمی تھا۔ جہاں جاتا رشتے بنالیتا یہی رشتے اسے ڈس گئے۔ زیر یاب نے بس کے حوالوں کو مٹی میں رول دیا۔ اس دن صرف فیروز لالہ نہیں مرا تھا..... محسوس اور مروت کی موت ہوئی تھی، سچائی کا خون ہوا تھا۔ میں بڑی سے بڑی قسم اٹھانے کو تیار ہوں۔ وہ شخص مجھے تو کیا کسی عورت کو غلط نظر سے نہیں دیکھ سکتا تھا مجھے تو ہرگز نہیں۔ اس لیے بھی کہ اس کے مجھے بہن کہا بھی نہیں مانا بھی تھا اور اس لئے بھی کہ میں زیر یاب کی بیوی تھی، لیکن زیر یاب کی جسے اپنا سب سے قریبی دوست کہتا تھا وہ اور اس زیر یاب نے ہی.....

میرے سالوں سے مرے ہوئے دل میں اچانک ایک شدید حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب مجھے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ نجانے زیر یاب کی طرح اور کتنے لوگ ہوں گے جو اس کے اور میرے رشتے کو بدگمانی کی نظر سے دیکھتے ہوں گے۔ میرا بس چلے تو اپنی جان دے کے بھی سب کو یقین دلادوں کہ وہ میرا لالہ تھا میرا بھائی..... صرف اور صرف بھائی۔ تم..... تم تو یقین کرتے ہوناں میری بات کا۔“ اس کے سر ہلانے پر مومنہ نے سکون سے نیچے پر سر ٹکا دیا۔

”تو تمہاری تسلی ہو گئی اب۔“

”لیکن.....“ دروازے نے بے آواز حرکت کی اور مقدس دو قدم اندر چلی آئی۔ اس کی آواز پہ خوشنود بری طرح چونک کر پیچھے پلٹا۔ مومنہ بھی ایک جھٹکے کے ساتھ ساتھ

اٹھ بیٹھی اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں ہلکے نیلے شلوار قمیص اور سفید بڑی سی چادر میں ملبوس اس کم عمری ”مومنہ“ پہ جی تھیں جس کے چہرے پہ اتنی ہی تھکان تھی، آنکھوں میں اتنی ہی ویرانی تھی، جتنی کہ اس بستر پر پڑی ”مومنہ“ کی آنکھوں اور چہرے پہ تھی۔

”لیکن میری تسلی نہیں ہوئی..... میری..... یعنی مقدس زریاب خٹک کی..... بہت سے سوال ہیں جن کے جواب مجھے چاہئیں..... اگر ڈاکٹر خوشنود نے اپنے سوالات کے لیے فیروز علی وردگ کا بیٹا ہونے کا حق استعمال کیا ہے تو میں زریاب خٹک کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں زریاب خٹک جو آپ کا شوہر ہے..... اب بھی..... ابھی تک..... آپ..... آپ..... مومنہ علی..... آپ میری ماں ہونے کی حیثیت سے مجھے جواب دہ ہیں۔“

وہ آہستہ آہستہ چلتی اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بیڈ تک پہنچی۔ مومنہ فکر کر رہی تھی کہ اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اگر وہ اپنا تئرف نہ بھی کر لیتی تو تب بھی اسے سیکنڈ نہ لگتا مقدس کو پہچاننے میں وہی پیشانی..... وہی سنہری رنگت..... ہلکے ابروؤں پہ قطار کے ساتھ بنے وہی بھورے تین تل..... جو اس کے چہرے پر قدرتی تھے..... اور وہی نیلی کانچ سی دھلی دھلی آنکھیں۔

”یوں لگتا ہے جیسے نیلم کے ٹکڑوں کے گرد کسی سے میرے پورے چور کے بکھیر دیے ہوں۔“ اس کی پلکوں پہ ننگے آنسو دیکھ کے مومنہ کو وہ بات یاد آئی جو زریاب نے اسے پہلی بار روتا دیکھ کے کہی تھی۔ اس نے سالوں سے سنے بازو اپنی بیٹی کے لیے پھیلا دیے۔ اس کا دل اچھل اچھل کے پسلیوں تک پہنچنے لگا اپنی لاڈلی کو چھالنے سے۔ مومنہ کے دل پہ اس کی..... لیکن وہ دل خود ہی حیران سا ہو کے رک گیا..... وہ بازو خود ہی پشیمان سے ہو کے تود میں دوبارہ آگرے جب اس نے مقدس کو کسی جذبے اور احساس کے بغیر وہیں کھڑے خود کو گھورتے پایا۔

”تو تم بھی..... تم بھی ان میں سے ہو جنہیں یقین کرنے کے لیے میری جان کی ضرورت ہے..... آہ..... مجھے خبر نہ تھی کہ میرا اپنا خون بھی مجھے بے اعتبار جانے گا۔“

”میں یقین کر سکتی ہوں بلکہ مجھے یقین ہے ان سب باتوں کی سچائی کا جو آپ نے کہیں لیکن.....“ اس کے الفاظ پھر سے مومنہ کو زندہ کر گئے۔

”لیکن یہ آدھا سچ ہے۔ سچ کبھی ادھورا نہیں ہوتا۔ سچ کبھی مصلحت پسند نہیں ہوتا۔ سچ کبھی بزدل نہیں ہوتا..... سچ کو روپوشی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ آپ کہہ رہی تھیں ناں

ابھی کہ میرا بس چلے تو اپنی جان دے کر سب کو یقین دلادوں کہ فیروز اور میرا کیا رشتہ تھا تو پھر..... آپ نے یقین کیوں نہ دلایا۔ آپ کے چہرے پہ ظلم کا یہ نشان گواہ ہوتا آپ کی بے گناہی کا۔ جو جھوٹ میرے باپ کو مشتعل کرنے کا سبب بنا تھا وہ اگر اتنا ہی بے بنیاد اور کھوکھلا تھا تو آپ ایک ہی وار میں اسے مسمار کر سکتی تھیں لیکن آپ نے ایسا نہ کیا..... آپ نے ایسا کرنے کی کوشش ہی نہ کی..... آپ فرار ہو گئیں..... کیوں..... کس لیے؟“ وہ پھٹ پڑی۔

”کیونکہ میں جاننے لگی تھی پھولوں کے رنگ کالے کیسے ہوتے ہیں“ مومنہ نے سرگوشی کی، ایسی سرگوشی جسے صرف وہ ہی سن پاتی تھی۔

”آپ بتاتی کیوں نہیں ایسا کیا تھا جس کو چھپانے کے لیے آپ کو خود چھپنا پڑا؟“

”کچھ نہیں.....“ وہ مضطرب کر سکی اور اتنی ٹھانہت کے باوجود چیخ اٹھی۔ اس کا بدن لرز رہا تھا اور رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ خوشنود کے اندر کا ڈاکٹر بیدار ہو گیا۔ اس نے فوراً اٹھ کے نرس کو نیل دی اور اتنے عرصے میں پہلی بار مقدس کو مخاطب کیا۔

”مس مقدس..... ہو سکے تو آپ کل تشریف لے آئیے ان کی حالت ایسی ہرگز نہیں کہ یہ کوئی شدید اعصابی اور جذباتی جھٹکا سہہ سکیں۔“ اس نے اسے دیکھے بغیر پیشہ دارانہ سی رائے دی۔ جسے ان سنی کرتے ہوئے مومنہ ہانپتے ہوئے کہنے لگی۔

”میں کچھ چھپانے کے لیے فرار ہوئی تھی نہ ہی اپنی جان بچانے کے لیے۔ میں اس کے سامنے اس کے اس کی جھوٹی غیرت کی تسکین نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں..... میں تین دن کے لیے اس کی پیاسی صرف اس کے انتظار میں راستے کا پتھر بنی رہی، اس کی راہ نکلتی رہی۔ وہ اسے کاڑھتا ہوا آئے گا..... میری حالت دیکھ کے اس کا خون کھول جائے گا..... مجھے ملنے والے ایک ایک زخم کا حساب لے گا وہ..... اور وہ آیا..... مجھے ایک نیاز زخم دینے کے لیے۔ میری رہی سہی جان بھی نکالنے کے لیے..... مجھے مان دینے والے واحد شخص کو مجھ سے چھیننے کے لیے..... میں سہہ جاتی؟ بتاؤ میں ایسے ہی سہہ جاتی؟ میں کچھ نہ کرتی؟ میں نے بھی وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا..... ایک ہاری ہوئی..... روندی ہوئی ریزہ ریزہ عورت کو کیا کرنا چاہیے تھا..... میں نے..... میں نے.....“

اس کی آواز ڈوبنے لگی۔

”میں نے وہی کیا..... بالکل ٹھیک کیا..... زریاب کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔“ وہ نڈھال ہو گئی۔ خوشنود نے بے بسی سے نہ چاہتے ہوئے بھی مقدس کو دیکھا وہ چپ

چاپ اٹنے قدموں باہر نکل گئی۔

نرس نے کچھ ہی دیر میں مومنہ کو پرسکون کر دیا۔ آکسیجن کی تالی اور مصنوعی دھڑکنوں کے سہارے وہ غنودگی کے عالم میں تھی۔ اس کا ہاتھ خوشنود کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ اپنی الجھن سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسے رہ رہ کے مقدس پہ غصہ آتا جو جاتے جاتے اسے بھی ایک سوال میں الجھا گئی تھی۔

اس عورت کے ایک ایک لفظ پر ایمان لانے کو جی چاہتا تھا۔ خود اس کی ماں کی گواہی بھی کافی تھی اس لیے ہی تو وہ اتنی اپنائیت اور عقیدت کے ساتھ اسے پھوپھی جی کہتا تھا لیکن..... پھر وہ فرار۔ یہ اس کے گمان سے بھی باہر تھا۔ زریاب پہ اس کا غصہ سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن اولاد تک سے چھپ جانا؟ زریاب کو تو قانون نے سزا دی تھی۔ یہ ایک بات کہ بار بار کی اپیل نے سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا لیکن پھر..... وہ سر جھٹک کے اٹھ کھڑا ہوا۔

”فی الحال مجھے ان کے مکمل صحت یاب ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔“ اس نے سوچا حالانکہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ جس قدر خراب حالت میں وہ اسے اٹھا کے اس ہسپتال تک لایا تھا، اس کے بعد اس کا نہ صرف زندہ بچ جانا بلکہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ اتنی دیر گفتگو کرنا بھی ایک معجزہ ہی تھا اور اب ایک اور معجزہ ہی ہوگا اگر مومنہ ان مصنوعی سہاروں کے بغیر بھی زندہ رہ لے۔

وہ پوری رات اس نے موت سے لڑتے لڑتے گزاری۔ ہر بار ہوش میں آنے کے بعد اس کے لبوں پہ مقدس کا نام ہوتا اور پھر وہ ڈھسے جاتی۔ اس کی ذہنی نبضیں اور رکتی دھڑکنیں خوشنود کو فکر مند کر جاتیں لیکن رات گزرتے ہی جیسے جیسے اس کا غصہ کم ہوتا گیا، اس کی دل میں اپنے لیے بدگمانی اور خدشے چھوڑ کر سہارا کی تلاش چاہتی تھی۔

”تم..... تم خوشنود..... تم کیسے جانتے ہو مقدس کو؟“ ذرا سنبھلتے ہی اس نے سوال کیا۔ ایسا سوال جس کا اصل جواب دینا شاید خوشنود کے لیے خود کو ہار دینے کے مترادف تھا۔ ”بس کچھ ہی دن پہلے اتفاقاً ملاقات ہوئی تھی لیکن درحقیقت وہ پہلے ہی آپ کی تلاش میں تھیں۔ انہیں کسی نے آپ کے لاہور میں ہونے کی اطلاع دے دی تھی۔ آپ کے ساتھ رہنے والی اماں برکتے تک تو وہ پہنچ ہی چکی تھیں اور ایک دن اماں کو میرے ساتھ دیکھ کے مجھ سے پوچھنے لگیں۔ پتا نہیں کیوں میرا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں کہ ان کا

آپ سے کیا رشتہ ہو سکتا ہے، میں کچھ سوچے سمجھے بغیر آپ کے پاس لے آیا۔ مجھے ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو پہلے آپ سے ذکر کر لیتا۔“

”میں نے کہا بھی تھا کہ کسی کو میرے متعلق پتا نہ چلے اور کیا تمہیں اس کی صورت دیکھ کے بھی کچھ محسوس نہ ہوا۔“

”ہوا تھا..... بہت کچھ محسوس ہوا تھا۔“ وہ کھویا کھویا سا سامنے رکھے پھولوں کو بے دھیانی سے تنک رہا تھا۔

”تمہیں تو اسے دیکھتے ہی پتا چل جاتا چاہیے تھا کہ وہ میری بیٹی ہے۔“

”میں نے کہا ناں.....“ وہ خود کو بھی بھلا چکا تھا۔

”میں نے کہا ناں میرا دھیان کسی اور طرف گیا ہی نہیں..... اس سے ہٹنا تو کہیں جاتا۔ مجھے کچھ یاد نہ تھا نہ آپ کی ہدایت نہ کچھ اور..... وہ سامنے ہو تو پھر مجھے بس.....“ خوشنود مومنہ بے یقینی سے پکار پھڑکی۔ اس کی غبار غبار ہوتی آنکھیں جھٹک پڑیں اور وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔ خفت سے اس کا گندی چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ کتنی ہی دیر اسے دیکھتی رہی۔

”خوشنود بس ایک بار اور میری مدد کرو۔ مقدس کو ایک بار میرے سامنے لے آؤ مجھے اسے کچھ کہنا ہے..... اب تو مجھے اس سے سب کچھ کہنا ہی پڑے گا۔ بات صرف میری نہیں رہی۔ وہ کہانی جو مجھ سے شروع ہوئی تھی۔ وقت نے اس میں کتنے کردار شامل کر دیے ہیں۔ مجھے اب ہر کردار کا حق پورا کرنا ہے اسے بلاؤ۔“

”نہیں پھوپھی جان اس نے اپنی معذوری ظاہر کی۔“

آپ میرے لیے قابل احترام سہی لیکن میں کیسے بھولوں کہ وہ خان زریاب خٹک کی بیٹی ہے۔ مجھے اس کے سامنے جانے پہ مجبور مت کریں۔ میں کمزور نہیں پڑنا چاہتا۔“

”وہ صرف تمہارے دشمن کی بیٹی نہیں تمہاری پھوپھی کی بیٹی بھی ہے اور تمہاری پھوپھی ان مہمان سانسوں کے ساتھ اپنی اکلوتی اولاد کو دیکھنے کی خواہش کر رہی ہیں۔ کیا تم اس کی یہ خواہش پوری کرو گے۔“

وہ چپ چاپ ہنسی پیش کرنے لگا۔

”نہیں ڈاکٹر خوشنود..... میں نہیں آ سکتی۔ جس ماں کی تلاش نے مجھے اٹنا بھڑکایا، اس کے مل جانے نے مجھے اور الجھا دیا ہے جب تک وہ میری اس بات کا تسلی بخش جواب نہیں دیں گی کہ وہ کیا وجہ تھی جس نے انہیں اپنی اولاد تک کو فراموش کر دینے پہ مجبور کر دیا،

میں کبھی انہیں اپنی ماں تسلیم نہیں کروں گی۔ مجھے اپنی بچپن کی تمام خوفزدہ کردینے والی راتوں اور محروم اجازتوں کا حساب چاہیے۔“

”خدا سے دعا کیجئے کہ وہ آپ کی ماں کو اس حساب کتاب کے لیے زندہ رکھے۔“

اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”جی..... کیا مطلب؟“

”مطلب یہ مس مقدس کہ آپ تسلیم کریں یا نہ کریں اس حقیقت کو جھٹلاتے ہوئے نہیں سکتیں کہ وہی آپ کی ماں ہیں۔ ایک اکلوتی اولاد ہونے کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ ان کے آخری وقت میں ان کے قریب رہیں۔ ان کے کیا فرائض تھے کیا نہیں، اس بحث میں پڑنے کا کافی الحال وقت نہیں ہے۔ اس نے صاف صاف کہتے ہوئے رابطہ قطع کر دیا۔ اس کی توقع کے عین مطابق آدھے گھنٹے کے اندر اندر مقدس وہاں موجود تھی۔ اس نے کترا کے نکل جانا چاہا لیکن مومنہ نے ہاتھ سے اشارے سے روکنے کے لیے کہا۔

”مقدس! میری بیٹی! کیا تمہارے دل میں اپنی ماں کے خلاف اتنا زہر بھردیا گیا ہے کہ برسوں بعد ملنے کے باوجود تم نے اپنی ماں کے گلے لگنا گوارا نہ کیا۔ میری باتیں پھیلی رہ گئیں اور تم..... واپس چلی گئیں۔“

”آپ غلط سمجھ رہی ہیں میرے دل میں نہ ہر قسم کی قسم کا کوئی شک ہے۔ آپ نے خود کچھ بھی کہا میں اس کا یقین کرتی ہوں اور آپ اور جو بھی بتائیں گی میں اس کا یقین کر لوں گی لیکن آپ بتائیں تو سہی..... مجھے جواب تو دیجئے کہ مجھ سے..... میری ذات سے آپ کو کیا خطرہ ہو سکتا تھا جو آپ نے خود کو اتنا جھکا کر رکھا۔“

”مجھے تم سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ مجھے کسی سے کیا خطرہ نہیں تھا میں خود اپنے خوفزدہ تھی۔ اپنے اندر کی محبت کی ماری عورت سے ڈرتی تھی، اپنی ممتا سے خائف تھی مجھے خطرہ تھا تو اس بات سے کہ کہیں میرے اندر کی محبت پھر مجھ پہ حاوی نہ ہو جائے۔“

”اپنی اولاد سے محبت کرتے ہوئے ڈرتی تھیں آپ کیوں؟“ وہ بے بسی سی کرنے کے انداز میں نزدیکی کر سی پہ بیٹھ گئی۔

”میں آپ کی یہ مبہم باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کیا اتنے سالوں میں کبھی آپ کو مجھے کھودینے کا ملال نہیں ہوا۔ کبھی بھی آپ میرے لیے نہیں تڑپیں۔ کبھی میرے لیے فکر مند نہیں ہوئیں؟“

”میں نے تمہیں کھویا نہیں تھا مقدس میں خود کھو گئی تھی اور دیکھو آج تمہیں مل گئی

ہوں۔ تم مجھ سے جدا نہیں ہوئی تھیں صرف میری آنکھوں سے اوجھل ہوئی تھیں پھر ملال کس بات کا۔ ہاں کک تھی سو وہ تو نصیب کا ایک حصہ جان کے سنبھال لی سینے میں۔ میں تو یہ جان کے خود کو مطمئن کر لیتی کہ تم اپنوں میں ہو۔ اپنے باپ کے گھر..... اپنے خاندان کے ساتھ..... ایک مضبوط چھت کے نیچے۔“

”ہونہہ..... اپنے۔“ وہ اداسی سے مسکرائی۔

”میں نے بیس سال اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے گزارے ہیں۔ عمر کا آدھا حصہ..... ہاں وہ حصہ جس میں کسی بھی انسان کو ہاں باپ کی سب سے زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ حصہ میں نے ان دونوں رشتوں سے یکسر انجان رہتے ہوئے گزارا۔ بہت سے لوگوں کے ماں باپ نہیں ہوتے، کئی لوگ پیدائشی یتیم ہوتے ہیں لیکن وہ کم از کم اتنا تو جانتے ہیں کہ ان کے باپ کی قبریں کہاں ہیں؟ وہ کون تھے کیسے تھے؟ اور میں..... میں تو اتنا بھی نہیں جانتی تھی میرے ماں باپ زندہ ہیں یا پھر.....

میں تو اپنی ماں کے نام سے بھی انجان تھی۔ بیس سال بعد میں جان پائی کہ وہ دونوں زندہ ہیں اسی زمین کے کسی کونے پہ موجود ہیں۔ بابا جان کے مجھ سے دور رہنے کی وجہ کیا تھی وہ سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن آپ تو آزاد تھیں پھر کیوں یہ خود ساختہ دیواریں کھڑی کر لیں۔“

”میں آزاد کب تھی..... میں آزاد کب ہوں۔ تم جانتی ہو مقدس پھولوں کے رنگ..... میں بھی نہیں جانتی تھی..... تمہارا باپ جانتا تھا لیکن وہ مجھے بتا نہیں..... میں خود ہی جاننے لگی جب کسی پھول کو محبت کا پانی ملنا بند ہو جائے۔ اس کی جڑوں میں زہر اتر جائے تو..... تو آہستہ آہستہ وہ کالا پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ میری بڑیاں بھی ایک دم زہریلی ہو گئی تھیں..... میرے دل کے کالے پن نے مجھے یہ سب کرنے پہ مجبور کیا۔“

”کیا؟“ وہ بے تابی سے بول اٹھی لیکن مومنہ کا دھیان اس پہ نہیں تھا وہ اپنی ہی کہتی رہی۔ ”اور جانتی ہو اس پھول سے نازک دل کو کالا کس نے کیا۔ نفرت نے..... نفرت چیز ہی ایسی ہے، پیار چاہے تو پتھر میں بھی خوشبو بھردے اور نفرت..... نفرت بھی کمزور جذبہ نہیں۔ نفرت چاہے تو پھول میں آگ لگا دے۔ مجھے غیسی مہنتوں کی ماری کھلے کے سراپا شعلہ کر دے میں نے اس نفرت کو سنبھال کے رکھ لیا اس نفرت کے بغیر میں بڑی کمزور تھی۔ مہنتیں کمزور بنا دیتی ہیں نا..... میں نے نفرت کے سہارے مضبوط بنا چاہا، اتنی سنگدل بننا چاہتی تھی میں کہ.....“ وہ بولتے بولتے رک گئی اک نظر دونوں کو دیکھا۔

”کہ زریاب کو سزا سناتے ہوئے میرا دل نہ کانپے۔“
 ”مگر زریاب خٹک کو قانون نے سزا دی تھی۔“ اب تک لا تعلق بیٹھا خوشنود کہہ اٹھا۔
 ”ہاں..... قانون نے ہی سزا دی تھی۔ فیروز لالہ کے قتل کی..... لیکن..... زریاب قاتل نہیں ہے۔“ مومنہ نے کہا۔

”کیا کمایا تو نے حضرت؟“ بی بی جان نے اپنے گورے، پھولے پھولے مگر گہری لکیروں سے بھئی سخت ہتھیلی والے ہاتھ بغور دیکھتے ہوئے خود سے سوال کیا۔
 ”زندگی میں سب کچھ ”بھرم“ ہی تو نہیں ہوتا۔ کیا ہوتا ہے یہ ”بھرم“ اتنی کھوکھلی چھت..... اتنی ہلکی چادر..... یہ کیا سر چھپائے گی۔ پھر بھی فقط اسے سلامت رکھنے کے لیے انسان سب کچھ داؤ پر لگانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ یہ بھرم ہی تو تھا جس نے اتنے سالوں تک یہ کھیل مجھ سے کروایا۔ یہ ٹھیک ہے کہ پہلے بی بی کی محبت نے یہ سب کرنے پر مجبور کیا لیکن پھر..... پھر کیا ہوا..... نہ بی بی رہی..... نہ اس کی خوشیاں..... جتنا بھی گھروں سے دور ہو گیا..... اس کے بعد صرف یہ کم بخت بھرم ہی تو رہ گیا تھا جسے بچانے کے لیے اتنے سال تسلسل سے یہ تماشا ہوتا رہا۔ کیسے اپنے بچوں کی نظر میں خود کو ہلکا کرتی میں، اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے، لیکن وقت سے بڑا جابر اور کون ہے..... منوا ہی لیا مجھ سے سب کچھ..... اگر یہ سب یونہی ہونا تھا تو..... درمیان کے بیس سال کیوں آئے اگر آج مجھے اپنی اولاد کی نظروں سے گرنا ہی تھا تو کیوں بے کار اتنی زندگیاں برباد ہوئیں۔“

وہ خاموشی سے اپنا احتساب کرتی رہیں۔ تمام قصہ کہہ دینے کے بعد وہ وہاں ٹھہر نہ سکیں۔ زریاب کی حیران بے اعتبار اور افراسیاب اور دراب کی ملا متی نظروں کی وہ تباہ نہ لاسکیں۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے وہ اپنے اندھیرے کمرے میں اپنے روبرو کھڑی رہیں۔ ڈھونڈ رہی تھیں۔

بے شک ضمیر نے یہ کوڑا آج پہلی بار لہرا کے انہیں مارا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ بیس سال تک ان کا ضمیر دل کے کھلی کونے میں سویا رہا تھا۔ وہ تو عرصے سے چنگیاں بھر رہا تھا اور اس نے تو پہلی چنگی تب بھری تھی جب ان کی آنکھوں کے سامنے زریاب بندوق لہراتا ہوا نکلا تھا۔

انہیں اپنے اقدام کے سنگین نتائج کا اندازہ تب ہی ہو گیا تھا۔ وہ تو سمجھتی تھیں زریاب بیوی سے بدگمان ہو کے اس سے تعلق توڑ لے گا اور یوں وہ بڑی آسانی سے مومنہ کا چاچا صاف کر پائیں گی لیکن زریاب خٹک جیسے پختون النسل بکے سامنے اس کی بیوی کے

خود ساختہ معاشرے کی تفصیل اتنے بے رحم الفاظ کے ساتھ بیان کرتے ہوئے وہ بھول گئیں کہ بھلے اپنے اصل سے وہ کتنا ہی دور دور رہا ہو، ہے تو ایک ”خانزادہ“ ہی جسے غیرت سے آگے کچھ سوچتا نہیں۔ اسے بھی کچھ نہ سوچھا۔ پل بھر میں جان سے عزیز بیوی اور قابل اعتبار یار کے خون کا پیاسا بن گیا اور یہ پیاس اسے پھانسی کے تختے تک لے گئی۔

زریاب نے اپنی حرکت کا اتنا سخت انجام سہہ نہ سکی اس کے دماغ کی شریان پھٹ گئی۔ ذہنی حالت تو اس کی دن بدن کمزور ہوتی ہی جا رہی تھی یہ آخری اور شدید جھٹکا اس کا کمزور دماغ سہہ نہ سکا اسے ہر غم سے بے نیاز کر گیا۔

خان جی، وہ تو تب ہی لڑکھڑا گئے تھے جب ان کا بیٹا خون کی ایک نئی تاریخ رقم کرنے چلا تھا۔ ان کو قاتل کا پہلا حملہ اسی دن ہوا تھا پھر زریاب کی گرفتاری، موت کی سزا، بی بی کی اچانک موت یہ سب حادثات انہیں بستر تک کا ہی کر گئے۔ برموں سے وہ اپنے رعب و دبدبہ والے اونچے لمبے خان جی کو بستر پہ مفلوج بے بس، بے زبان پڑا دیکھ کے کڑھ رہی تھیں۔ لیکن جو جھوٹ بول دیا تھا وہ بھانا تو تھا ہی۔ اب سچ کہہ بھی دیتیں تو کیا ہو جاتا۔ کیا فیروز زندہ ہو جاتا؟ زریاب آزاد ہو جاتا؟ یا زریاب لوت آتی؟ وہ چپ چاپ اس چنگیاں بھرتے ضمیر کو نظر انداز کرتی رہیں اور مقدس..... اس کی صورت ایک تسلسل عذاب ان کے سر پہ بیس سال تک مسلط رہا۔

مقدس کی صورت میں ایک چلتی پھرتی مومنہ کیا کم سزا تھی ان کے لیے..... اس کی صورت انہیں وہ سارا واقعہ بھولنے نہ دیتی راتوں کو اس کا پھل پھل کے رونا ان کے دل میں جھجک لگاتا۔ ہر کمرے میں گھنٹوں گھنٹوں چل کے جاتی اپنی ماں کو ڈھونڈتی پھرتی وہ رونی صورت کی بی بی انہیں خود سے سوال کرتی محسوس ہوتی۔ وہ چڑ جاتیں اس کے سامنے کم سے کم..... بی بی نے مخاطب کرنے کی نوبت تو اکثر آتی ہی نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھیں اس حویلی کی تاریخ سے مومنہ کا باب ہی مٹ جائے۔ کسی کو یاد نہ رہے کبھی زریاب کی کوئی بیوی یہاں آئی بھی تھی اور اس میں وہ خاصی حد تک کامیاب رہی تھیں۔ بڑی بہو یہاں نہ ہونے کی وجہ سے سارے قصے سے لاعلم تھی ہی، چھوٹی بہو اس واقعے کے کئی سال بعد آئی۔ سب مومنہ کے بارے میں وہ ہی جانتے تھے جو بی بی جان نے زریاب سے کہا تھا۔

دراب بھائی کی طرف سے ملنے والی شادی کی تصویروں میں سنہری بالوں، گلابی اور سنہری رنگت والی، بلوری آنکھوں والی بھابھی کو غیر ملکی ہی سمجھا اور کسی نے اس کی یہ غلط فہمی عرصہ تک دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نتیجتاً اکثر لوگ یہی جانتے زریاب کی بیوی کوئی ”میم“ تھی۔ اس کا ذکر اس گھر میں ممنوع تھا۔

شاید رفتہ رفتہ لوگ اس قصے کو یکسر فراموش کر دیتے اگر..... مقدس کا وجود نہ ہوتا۔
اس لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے بے ضرر وجود سے نفرت کرنے پہ مجبور ہو گئیں اس
کی سوال کرتی آنکھیں انہیں زہر لگتیں ایسا لگتا جیسے مومنہ سامنے آنکھری ہو اور کہہ رہی
ہو۔ ”کیوں؟ بی بی جان کیوں؟“

”آہ کیوں؟“ وہ خود کو کوسنے لگیں۔ ”کیوں میں ایک مومنہ کے بعد دوسری مومنہ
سے کھیلتی رہی۔ کیا اس کی ماں کافی نہیں تھی میری نفرتوں کی تسکین کے لیے جو میں اس
معصوم سے بھی بدلے لیتی رہی شاید میں ڈرتی تھی وہ اس قابل نہ ہو جائے کہ اپنی ماں کا
بدلہ مجھ سے لینے میرے مقابل آجائے۔ ہائے حضرت تو نے کیا کیا..... کیا زریاب کا
اس کی نسل کا اس خاندان پہ کوئی حق نہ تھا کیا اس کے حصے کی خوشیاں ہی رہ گئی تھیں تیری
بیٹی پہ قربان ہونے کے لیے۔ تیری وجہ سے وہ دربار ہوا، اس کا گھر اجڑا، اس کی بیوی رسوا
ہوئی پھر بھی تو نے بس نہ کیا اس کی معصوم امانت تک کو چھتی رہی تمہاری گھسیٹائی ہوئی انا۔
وہ انھیں اور خان ارباب خٹک کے کمرے میں داخل ہوئے۔
کئی دنوں سے بے چین اور مضطرب خان ارباب خٹک کے ضعیف چہرے پہ اس
وقت اطمینان پھیلا ہوا تھا۔ ان کا ابھری رگوں والا لہجہ ہاتھ ابھی تک زریاب کے ہاتھوں
میں تھا بلکہ شاید جب سے وہ لوٹا تھا یہ ہاتھ تھاے ہوئے تھا۔ وہ تھکے تھکے قدم چلتی ان کے
سر ہانے پہنچ گئیں۔

”خان جی!“ انہوں نے سرخی مائل سوچی آنکھیں جھکائے جھکائے عرض کی۔
”خان جی! مجھے معافی دلادیں، مجھے زریاب سے معافی دلادیں خان جی۔“ ان
کے لہجے میں اتنی عاجزی تھی، اتنا کرب تھا کہ وہ تڑپ کے آنکھ کھلے۔
”بی بی جان! مجھے گناہ گار مت کہئے اس طرح میرے سامنے ہاتھ جوڑ کے مت
کھڑی ہوں کیوں مجھے میری ہی نظروں سے گرانا چاہتی ہیں آپ؟“ اس نے سانس لے لیا۔
تھام کے انہیں اپنے قریب بٹھایا۔

”نظروں سے تو میں گر گئی ہوں لیکن مجھے گلہ نہیں یہ میرے اپنے اعمال ہیں جنہوں
نے میری بزرگی ساری نسل کے سامنے پامال کی۔ میں کسی رعایت کی مستحق تو نہیں لیکن
معافی کا حق تو رکھتی ہوں۔ مجھے معاف کر دو زریاب..... تم مجھے معاف کر دو، مقدس مجھے
معاف کر دے تو شاید دل کچھ ٹھہر جائے ورنہ اب اپنے ہی دل کی ملائیں سہی نہیں جاتیں۔
نجانے مومنہ..... مومنہ کہاں ہوگی اس وقت۔“ زریاب جیسے کسی خواب سے چونکا تھا۔
”ہاں..... مومنہ..... مومنہ کہاں ہوگی.....؟ تم کہاں ہوگی مومنہ؟“

”وہ ہوتی تو میں اس سے بھی معافی مانگ لیتی۔ میں صرف تمہاری ہی مجرم نہیں
ہوں میں اس عورت کی مجرم بھی ہوں جو نجانے کتنے خواب آنکھوں میں سجا کے اس گھر میں
سہاگن بن کے آئی تھی۔ میں اس معصوم بچی کی مجرم بھی ہوں، اپنے بیٹے کی..... اپنے دل
کے ایک ٹکڑے کی..... میں نے تمہیں برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔“

”نہیں بی بی جان.....! آپ کم از کم میری مجرم تو نہیں ہیں۔ میں اپنی بربادی میں
کسی کو قصور وار نہیں ٹھہرا سکتا۔ آپ کو بھی نہیں۔ اپنی بربادی میں سب سے بڑا ہاتھ خود میرا
ہے میری بے اعتبار محبت کا۔ بلکہ آپ تو مومنہ کی مجرم بھی نہیں اس کا سب سے بڑا مجرم
میں ہوں۔ میرے اندھے جذبات اور جنون اسے لے ڈوبے۔ اپنی بیٹی کی تمام تر
محمودیوں کا سبب بھی میں ہی ہوں۔ اس سارے قصے میں مجھے اور تو کوئی مجرم نہیں دکھائی
دیتا سوچتا ہے۔ یہ میں ہی تھابی بی جان..... یہ میرا کمزور عشق تھا جو بدگمانی کا ایک ہلکا
سادار نہ سہہ سہہ کر کے آپ کیوں معافی مانگتی ہیں بی بی جان..... معافی تو مجھے مانگنا ہے مقدس
سے..... مومنہ سے.....

”زر..... تم نے..... حضرت کو..... معاف..... بیٹا..... اپنی بہن..... بہن کو.....
بھی.....“ پانچا جان نے اسے متوجہ کر کے کچھ کہنے کی کوشش کی۔
”ہاں زریاب..... اپنی بہن کے لیے تمہارے دل میں جو گلے شکوے ہیں، وہ دور
کرلو..... اس کی روح کو بچھتاوے کے بوجھ سے آزاد کر دو..... اس کی بخشش کے لیے
دعا کرو۔“ بی بی جان نے التجا کی۔
”میں نے کہاناں بی بی جان..... میرے دل میں کسی کے خلاف کوئی شکوہ نہیں۔
اس دل میں اپنے ہی حال اس قدر ہیں کہ.....“ وہ بات ادھوری چھوڑ کے اٹھ کھڑا ہوا۔
اندرونی وگدار ہندا

”بی بی جان! مجھے گناہ گار مت کہئے اس طرح میرے سامنے ہاتھ جوڑ کے مت
کھڑی ہوں کیوں مجھے میری ہی نظروں سے گرانا چاہتی ہیں آپ؟“ اس نے سانس لے لیا۔
تھام کے انہیں اپنے قریب بٹھایا۔
”نظروں سے تو میں گر گئی ہوں لیکن مجھے گلہ نہیں یہ میرے اپنے اعمال ہیں جنہوں
نے میری بزرگی ساری نسل کے سامنے پامال کی۔ میں کسی رعایت کی مستحق تو نہیں لیکن
معافی کا حق تو رکھتی ہوں۔ مجھے معاف کر دو زریاب..... تم مجھے معاف کر دو، مقدس مجھے
معاف کر دے تو شاید دل کچھ ٹھہر جائے ورنہ اب اپنے ہی دل کی ملائیں سہی نہیں جاتیں۔
نجانے مومنہ..... مومنہ کہاں ہوگی اس وقت۔“ زریاب جیسے کسی خواب سے چونکا تھا۔
”ہاں..... مومنہ..... مومنہ کہاں ہوگی.....؟ تم کہاں ہوگی مومنہ؟“

اس کے صبح چہرے پہ نور کا وہ ہالہ
اس کے نکھرے سچے لہجے میں کوکتے وعدے
اس کی شفاف آنکھوں کے آئینے

اور اپنا وہ وعدہ..... جو میں نے کبھی بڑے سچے دل سے کیا تھا۔“ اسے یاد آنے لگا۔

”میں تال دو زرخ سزساں

جے میں کھ ماہی ولوموڑاں“

اور میں نے مکھ موڑ لیا..... کس سفاکی کے ساتھ..... کس بے دردی کے ساتھ اور کس

بھدے پن کے ساتھ۔

سالوں بعد آج وہ اس کمرے میں موجود تھا جس کی دیواریں اس کے جنون خیز عشق

کی ہر ہر ادا کی راز دار تھیں۔ وہ جدھر جدھر جاتی زریاب اسے تنگے جاتا۔

آئینے کے سامنے ہل دوپل رک کے ریشمی بالوں کی پہلے سے کی گئی چوٹیوں کے بل

اور کستی ہوئی اکٹائی اکٹائی سی مومنہ.....

”آف یہ بال، کتنی سکھی تھی میں تانی سے بال گنگوڑا کے دودھ دن نظر ہی نہ ہوتی تھی

اور اب.....“ وہ مڑ کے شکایتی نظروں سے اسے دیکھتی۔

”تمہاری نئی نئی فرمائشیں..... مینڈھیں مست کر..... بال کسے چھوڑو..... وغیرہ

وغیرہ..... بھلا تمہیں میرے بالوں سے کیا؟“

”کیا کہا؟“ پھر سے کہنا“ تنکے پہ سر رکھے ہوئے اسے دیکھتے دیکھتے وہ اچانک اٹھ

بیٹھا۔ ”مجھے کیا؟ مجھے نہیں تو اور تمہیں مطلب ہوگا ان بالوں سے؟ اتنے خوبصورت ریشمی

اور لمبے بالوں کی قدر ہی نہیں عجیب رسیاں سی بن کے چال چیلادیتی تھیں سر پہ اور اب بھی

کون سا میری ”نئی نئی فرمائشیں“ پوری ہو رہی ہیں۔ بال کھلے رکھنا تو ایک طرف تم میری

پسند کے مطابق ڈھیلے سے ہل والی چوٹی بھی نہیں کرتیں کس کسا کے یہ دو سینک لگا لیتی

ہو۔“ وہ اس کی دو چوٹیوں پر تھید کرتا۔

”کیا کروں، ڈھیلے بالوں میں سر روکنے لگتا ہے۔ اتنے سالوں کی عادت جو ہے لیکن

..... رنگ جاؤں گی آہستہ آہستہ تمہارے رنگ میں صیب۔“ جب کبھی وہ ترنگ میں ہوتی

تو اس کے چڑنے کے باوجود اسے ”عیب“ کہہ کے ضرور پکارتی۔

”سنو!“ اس کا لہجہ بدل جاتا اسے آئینے کے آگے سے ہٹے دیکھ کے۔

”تم کچھ دیر اور کھڑی رہو ناں یہاں۔“

”کیوں؟“

”اچھا لگتا ہے تمہیں ایک نظر میں ہی ”دودھ“ بار دیکھنا۔“ اس کی وارفتگی پہ اس کے

نہیں شہد پکانے لگتے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا اس درتپے کے قریب آیا جہاں صبح صادق کے وقت بیٹھ کے

عبادت کرنا مومنہ کو بے حد پسند تھا۔ زریاب بھی صبح خیز تھا لیکن اس نے تو شاید کبھی پو پھٹنے

کا انتظار بھی نہیں کیا ہوگا۔ سورج کی پہلی کرن کو خوش آمدید کہنے کے لیے وہ ہمیشہ اس

درتپے کے پردے ہٹا کر کھڑی ہو جاتی اور جب وہ جاگتا اسے ڈھونڈتا ہوا سیدھا نہیں

آتا، اسی درتپے کی طرف جو اس کے کمرے کے ساتھ متصل اسٹوڈیو کی چھپی طرف کھلتا

ہے۔ اس نے گرد اور سیلن سے بھری اسٹوڈیو کی فضا میں سانس لینے میں دشواری سی محسوس

کی۔ پرانے کاغذوں کے ڈھیر نے عجیب سی مہک پیدا کر رکھی تھی، اور خشک ہوتے پینٹ

سیلن زدہ سی بدبو پیدا کر رہے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کے پردے کھینچے۔ مختصر سی بالکونی

میں پتھر کا وہ بیچ آج بھی موجود تھا لیکن اس پہ جامن کے گہرے گہرے رنگ والے پتوں کا

سایہ نہ تھا۔ ایک ٹنڈ منڈ سادرخت افسردہ سا جھانک کے نبھانے کے ڈھونڈ رہا تھا۔ بیچ کے

ساتھ ابھی بھی قطار میں وہ گیلے گیلے تھے لیکن نہ تو ان میں گلاب باقی تھے نہ موتیا۔ وہ تھکا

تھکا سا اس سردی میں آئے بیچ پہ بیٹھ گیا لیکن اگلے ہی لمحے تڑپ کے اٹھا تھا جیسے یہاں، اس

مقام پہ بیٹھ کے اس سے کوئی بے ادبی سرزد ہوگئی ہو۔ اسے یاد آیا، مومنہ کا صبح کی اولین

ساعت جیسا ہی پاک اور معصوم سا چہرہ..... خفید سوتی دوپٹے میں لپٹا ہوا..... وہ یہیں اسی

نئی بیٹھ کے تلاوت کرتی تھی اور سامنے بیٹھا عقیدت سے اسے ٹکا جاتا۔

اس کے غیر محسوس سی حرکت کرتے گلابی لبوں کو..... ہل ہل کے پڑھتے ہوئے

کانوں میں ڈولتی بالیوں کو.....

چھٹی ہوئی آنکھوں کی لرزیدہ پلکوں کے سائے کو.....

سورج کی کرنوں سے دمک اٹھنے والی ناک کی لونگ کو.....

پیشانی پہ آویزاں اس پر نور سے عکس کو.....

کیوں.....؟

کیوں.....؟

کیوں بھلا دیا میں نے اس نور کو.....؟ کیوں نہ اس وقت مجھے یہ پاکیزگی یاد آئی

..... کیسے یقین کر لیا میں نے کہ مومنہ..... مومنہ اور فیروز..... کیا یہی تھا میرا عشق یہی تھی

میری محبت.....؟ یہی دعوے کیے تھے میں نے..... اتنی بودی محبت..... اتنے کھو کھلے

عہد..... میں جو خود کو بڑا روشن دماغ تعلیم یافتہ، سلجھا ہوا اور مچھوڑ شخص سمجھتا رہا ہمیشہ خود کو

اس سارے روایتی اور دقیانوسی سیٹ اپ میں اجنبی تصور کرتا رہا۔ اصل میں کیا نکلا؟ ایک

جاہل، کم نگاہ، وہی فرسودہ اور روایتی مرد..... جو کسی تیسرے شخص کی بے سرو پا باتوں پہ بغیر

کسی ٹھوس اور واضح ثبوت کے ہی ایمان لے آتا ہے..... جو غیرت اور انا کے آگے محبت اور اعتبار جیسے جذبوں کے پرچے اڑا دیتا ہے..... اور..... جو.....

”خان صیب..... خان صیب“

وہ پتا نہیں اور کتنی دیر خود کو کٹہرے میں کھڑا کر کے خود ہی پتھر مارتا رہتا کہ اورنگزیب کی آواز یہ چونک اٹھا۔ اسٹوڈیو سے نکل کے دیکھا تو وہ عجیب وحشت زدہ انداز میں کمرے میں گھوم گھوم کے اسے ڈھونڈ رہا تھا۔

”کیا بات ہے اورنگزیب؟“ اس نے متوجہ کیا۔

”وہ..... خان صیب..... بڑے خان جی..... اپنے باچا جان گزر گئے۔“ وہ دھاڑیں مارنے لگا۔

”لیکن زریاب..... وہ قاتل نہیں ہے۔“ مومنہ کے اس انکشاف نے خوشنود اور مقدس دونوں کو دم بخود کر دیا۔

حیرت کا ایک برقیلا شکنجہ تھا جس نے ان دونوں کو یوں بند کر دیا کہ وہ کوئی اور سوال کرنے کے قابل بھی نہ رہے۔ سختی سے آنکھیں بند کر کے لیٹی مومنہ نے کچھ دیر کسی آواز کا انتظار کیا اور پھر رک رک کے بتانے لگی۔

”ہاں وہ قاتل نہیں ہے لیکن..... صرف قانون کی نظر میں ہی اسے بے قصور ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ مجھ سے پوچھو..... مجھ سے پوچھو کہ اس کے دیکار ہاتھوں پر کس کس کا لہو ہے..... مجھ سے حساب مانگو میں بتاتی ہوں اس سے کتنے قتل ہوئے ہیں۔ کتنے جذبے بے موت مارے گئے ہیں، کتنے خواب سولی چڑھے ہیں، کتنی آرزوئیں سک سک کے فنا ہوئی ہیں اور کتنی محبتوں کا خون ہوا ہے اس شخص کے ہاتھوں.....

..... اس لیے..... صرف اس لیے میں نے۔“ اس کی بار بار انہی زبان ملک کے رت گئی۔ ”آپ نے پہلے اتنے جھوٹ کیوں بولے..... وہ ساری جھوٹی کہانی..... خوشنود نے سرے سے مجھے میں پڑ گیا۔

”نہیں..... میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے کبھی کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں جھوٹ بول ہی نہیں سکتی، میں نے پہلے تم سے جو کچھ کہا تھا اس کا حرف حرف سچائی لیے ہوئے ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے تم سے بہت سی باتیں چھپائی تھیں۔ کچھ پردے پڑے رہنے دیئے تھے۔“ وہ الزام سہ نہ سکی، اپنی صداقت تسلیم کرانے کے لیے جیسے اس میں نئی قوت پیدا ہو گئی۔ اس کی آواز اب پہلے سے بند تھی اور واضح بھی۔

”میں بھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔ جھوٹ بولنے سے بچنے کے لیے ہی تو میں وہاں سے بھاگ نکلی تھی۔ جھوٹ بولنا بھی میرے لیے ناممکن تھا اور سچ..... سچ بتانے سے زریاب کو سزا نہ مل پاتی اور میں اسے سزا سے کیسے بچنے دیتی۔ کیا غیرت اور حمیت صرف مردوں کی میراث ہے۔ کیا اپنی عزت پہ بن آتے دیکھ کے خون کی ندیاں بہانا صرف مردوں کا شیوہ ہے۔ کیا کسی عورت کے اندر بدلے کی آگ نہیں بھڑک سکتی جب اس کی وفا اور عزت پہ وار کیا جائے۔ کیا عورت کے اندر وفا، ممتا اور محبت کے خزانے بھر کے قدرت غیرت اور وقار رکھنا بھول گئی تھی؟ نہیں..... عورت بھی اپنی ذات اور اس کے تقدس کے حوالے سے اتنی ہی غیرت مند ہوتی ہے جتنا کہ ایک مرد اور پھر میرے جیسی عورت..... جس نے عزت کو محبت پہ ترجیح دی ہو، پہاڑوں نے اپنی گود میں لے کر جسے بچپن سے ہی اپنے جیسی سر بلندی اور پختگی عطا کر دی ہو، جو تن تنہا جنگلوں میں بسنے والی غیر قوم کے ساتھ سرانجام کے ایک عمر بتا چکی ہو۔ میرے لہو میں یہ سرکشی گردش کر رہی تھی، میں خود پر اٹھنے والی نگاہ بھسم کرنے کی قوت رکھتی تھی، خود پہ اٹھنے والی انگلی کیسے سلامت رہنے دیتی۔

تمہارے باپ نے مجھے پہاڑوں کی گود سے نکالا، شہر میں بسایا لیکن وہ میرے اندر کی خود سر اور غیور بخاران کو مکمل طور پہ تبدیل نہ کر پایا۔ اس کی محبت نے وقتی طور پر اس ناموس پر مرنے والی عورت کو سلا ضرور دیا تھا۔ کتنا ہی عرصہ اس کی محبت کے شماریل سرشار رہا لیکن ایک نامستری زندگی گزرتی رہی، اس کی ماں اور اس کی بہن کے طنز یہ اور تذلیل میں وہ بے حرکت رہے۔ میرے کانوں تک آتے لیکن ہلکی سی دستک دے کے لوٹ جاتے، وہاں وہ بے حرکت رہے۔ کبھی بولوں کا شور نہ ہوتا تھا۔

اس کے خاندان کی نفرت انیمز اور حقارت آمیز نظریں مجھ تک اٹھتیں لیکن میرے اندر کوئی شعلہ نہ بھڑکتا میری آنکھوں کے آگے تو زریاب کے مسکراتے چہرے اور جذبے لٹاتی نظروں کا ست رنگا پردہ پڑا ہوا تھا۔ لیکن جب خود زریاب کے بولوں میں وہی زہر اُترا..... جب خود اس کی آنکھوں میں میں نے بے اعتباری دیکھی تو کیسے میری مدہوشی نہ ٹوٹی۔ اس دن..... اس پل..... میرے اندر کی وہ پہاڑن پھر سے جاگ اٹھی تھی اور کسی طور نہ بہل رہی تھی۔“ وہ ہانپنے لگی۔ خشک ہوتے لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے اس نے دھندلی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھنا چاہا، سائے سے اس کی آنکھوں کے آگے لہرائے اور اس نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ اس کی ناتوانی نے اس کی تمام حسیات کو اکٹھے مستعد

رہنے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ مسلسل بولتے رہنے سے اس کی بصارت نے اندھیرے اوڑھنے شروع کر دیئے تھے۔ لیکن دماغ جاگ رہا تھا اور اس پہ وہ سارا منظر بہت واضح..... بہت صاف دکھائی دے رہا تھا۔

”زر..... یاب.....“ فیروز دھاڑا۔ ”ہوش میں رہ کر بات کرو۔“ اگرچہ وہ اس کی باتوں کے پس منظر سے ناواقف تھا لیکن میرے حوالے سے کہے گئے گھٹیا جملے سن کر اپنا گلہ برقرار نہ رکھ پایا۔

”ہوش میں تو میں اب آیا ہوں۔ تم تو شادی شدہ تھے ناں اور وہ بھی ونے سنے کے ساتھ..... تمہاری ایک نہیں دو دو ہمیش تمہارے سسرال بیای گئی تھیں اس لیے خود شادی کر کے اپنے لیے مسائل کھڑے کرنے کے بجائے تم نے زیادہ محفوظ رہنا چاہا۔“ کہیں تو صرف عیاشی کرنا تھی پھر چاہے وہ تمہارے اپنے ہی دوست کی بیوی نہ ہوتی۔ اور وہ..... وہ عورت اسے تو دولت اور مقام ہی چاہیے تھا پھر ایک دو عاشقوں کے ساتھ ملتا تو کیا برا ہوتا۔“ میں کہتا ہوں خاموش ہو جاؤ زریاب تم اپنے ہوش میں نہیں.....“

غصے کی شدت سے اس کی آواز کانپ رہی تھی لیکن زریاب واقعی ہوش میں نہیں تھا۔ اس کے دل و دماغ پہ اس وقت زہر چڑھا ہوا تھا وہ بولنا رہا۔ ”تم نے چند ہی منٹوں میں سارا کھیل بچھڑا لیا، ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مجھ سے اس کی شادی کرواتے ہوئے اپنا حصہ واضح رکھا اور یہ کرتے ہوئے تم نے پاک رشتوں کو استعمال کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔ اپنی پوزیشن صاف رکھنے کے لیے اور مومن سے تعلق جوڑے رکھنے کے لیے تم نے اسے بہن کہہ کر مجھے دھوکا دینا چاہا۔“

”بس..... بس کرو اپنی یہ بکواس ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ تمہارا رشتہ کیا ہے۔“ ”تمہارا اور میرا کوئی رشتہ نہیں۔ تمہارے اور میرے بیچ صرف ایک عورت تھی۔“ ”یہ راز کھل چکا ہے اب کچھ باقی نہ بچے گا نہ تم نہ وہ..... نہ تم دونوں کا مکروہ اور گھٹیا تعلق۔“

”اور تم دونوں تو بہت اعلیٰ اور ارفع ہو۔ وہ بدکردار عورت شوہر کی غیر موجودگی چند دن بھی نہ برداشت کر سکی اور اپنے مرد کے گھر میں ہی، اسی کی چھت کے نیچے اپنا یار بلوا کے عشق کے تماشے کرتی رہی اور جب بھانڈا پھوٹا تو گھر اور اولاد کو چھوڑ کے اسی کے ساتھ چل پڑی۔“ اس کے تفصیلی الزام پہ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا خود فیروز لالہ بھی

لڑکھڑاسا گیا۔

”یہ سب بکواس کس نے کی تم سے؟ تم نہیں جانتے ہو وہ میرے ساتھ کسی طرح اور کس حال میں آئی ہے۔ یہ ٹھیک ہے اسی نے مجھے بلوایا تھا مگر.....“ زریاب نے پوری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس پہ دوبارہ بندوق تان لی۔

”میری ماں نے خود تم دونوں کو دیکھا تھا عزت اور شرم کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے اور میرے لیے اس سے معتبر گواہی اور کوئی نہیں۔“ اچانک فیروز لالہ اس پہ پل پڑا۔ وہ اس سے بندوق چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا خون بھی جوش میں آ گیا تھا۔

”اگر تم میری بہن کے شوہر نہ ہوتے تو میں تمہارا خون بہا دیتا۔“ اس نے بندوق کا رخ اس کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے گھم گھماتے اور میں اسی طرح بیٹھتی تھی مگر سمجھتی تھی کہ یہ تکلیف دہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ میں چلا کے لالہ سے کہنا چاہتی تھی۔ ”بھادو اس کا خون..... مت پروا کرو یہ تمہاری بہن کا شوہر ہے..... یہ میرا شوہر نہیں ہے یہ..... یہ تو جانور ہے..... جانور..... جس کا شعور فنا ہو چکا ہے۔ جس کے اندر سے ہر جذبہ مٹ چکا ہے اب تو یہ سر سے پیر تک جانور ہے غلیظ وحشی اور درندہ جانور..... اور کوئی درندہ میرا شوہر نہیں ہو سکتا۔“

لیکن میں چنانچہ کیسے کر سکتی تھی۔ ایک ایسا سکتہ جو صرف جسم پر قابض ہوتا ہے، روح کو سب بھنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ میں سب دیکھ رہی تھی سب سن رہی تھی، صرف کچھ کہنے کی قابل نہ رہی تھی۔ کاش..... کاش یہ سکتہ مجھے مکمل طور پہ جلا لیتا..... میں کچھ دیکھ نہ پاتی..... کچھ سن بھی نہ پاتی۔

”بھائیو اپنی گندی زبان سے ان گندے تعلقات کو اس پاک رشتے کا نام نہ دو۔ وہ عورت تمہاری کیا کسی کی بہن بھی بننے کے قابل نہیں..... وہ کسی کی بیوی بننے کے قابل نہیں۔“

”نہیں زریاب مسلسل اپنے زہریلے خیالات سے اسے اور بھڑکار رہا تھا۔ فیروز لالہ نے اس کی بندوق چھین کے اسے اور مشتعل کر دیا تھا۔ اب وہ ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے اس پہ وار کر رہا تھا۔ اس نے اچانک بندوق اپنی طرف کھینچی شروع کر دی۔ اسی کھینچا تانی میں لالہ کی نظر دروازے پہ پڑی مجھے دلہن پہ گرے دیکھ کے اس کی حرکت بس ایک لمحے کے لیے تھمی تھی۔ اس کے چہرے کی سرخ رنگت یکدم زرد پڑ گئی۔ میں نے ان آنکھوں میں شکست..... اور شرمساری کے سائے لہراتے دیکھے۔ شاید اسے اپنے وہ سارے دعوے یاد آئے تھے جو اس نے مجھے اس شادی پہ رضامند کرتے ہوئے کیے تھے یا پھر شاید بہن کے

سامنے ہی اپنے رشتے کی پامالی نے اسے پاتال میں گرا دیا تھا۔

اسے کمزور بڑا دیکھ کے زریاب نے بندوق کی نالی کا رخ اس کی گردن کی طرف کر دیا۔ میرادل اُچھل کے حلق میں آ گیا میں نے بے اختیار لالہ کے ڈھیلے ہوتے ہاتھوں کو بندوق پہ نیچے کی طرف پھسلتے ہوئے دیکھا، عجیب حسرت زدہ انداز میں مجھے دیکھ کے اس نے فائر کر دیا۔ اور۔۔۔ اور میرادل حلق سے پھسل کر کہیں نیچے۔۔۔ بہت نیچے گر گیا۔ میں جان گئی اس نے یہ فائر کیوں کیا تھا۔ غیرت کا ایک رنگ یہ بھی تو ہے۔۔۔ زریاب نے اس کی پاکیزگی پہ کچھ اچھالا تھا ایک بھائی کو گالی دی تھی۔ وہ میرے سامنے ہی اتنی بڑی گالی سہہ نہ پایا، شرم نے اسے اپنی جان لینے پہ مجبور کر دیا۔ فائر کی آواز سن کے ملازم اندر چلے آئے۔ لالہ خون میں لت پت نیچے بڑا تھا۔ موت نے اسے ایک پل میں ڈھانپ لیا تھا۔ لوگوں نے بندوق پڑے زریاب کو ہر طرف سے جھڑ لیا وہ ابھی بھی اسی کیفیت میں تھا۔

”چھوڑو مجھے۔۔۔ میں کہتا ہوں چھوڑو مجھے۔“

”تم نے ہمارے صیب کو مار دیا۔ مار دیا ہے۔“ ہر طرف چیخ و پکار مچی تھی۔ کئی ملازم روتے چلاتے مردان خانے کے اندرونی حصے کی طرف دوڑے۔

”ہاں میں نے مارا ہے اسے۔ میں خود کہہ رہا ہوں میں نے مارا ہے اسے۔“

مارنا کوئی شرم کی بات نہیں جو میں چھپاؤں گا۔

”میں بزدل نہیں ہوں، میں کہیں نہیں بھاگتا، مجھے چھوڑ دو ابھی ایک حساب باقی ہے ابھی مجھے اس کی جان بھی لینی ہے۔“

میرے اندر جیسے ایک زور کا پتھر آن گرا اور پھر سے میرے اندر جان پڑ گئی۔ میں نے سن ہوتے ہیروں پہ کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ زریاب کے الفاظ نے مجھے ایک نئے راہ بھائی۔ وہ اتنے طیش کے عالم میں تھا کہ یہ بھی محسوس نہ کر سکا، اس کے دونوں ہاتھ تو بندوق کی نالی پہ تھے۔ اس نے لالہ کے ہاتھوں کی حرکت دیکھی ہی نہیں۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ قتل اس نے کیا ہے اور اندر آئے ہوئے ملازمین بھی یہی سمجھ رہے تھے۔ دیکھا جائے تو ایک طرف سے یہ سچ بھی تھا لیکن میری نظر سے کون دیکھتا؟ میں نے نظر و عقل کے اس دھوکے کو برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا۔ حقیقت کیا تھی، یہ صرف میں اور لالہ جانتے تھے یا پھر خدا۔ فیروز لالہ کچھ کہنے کے قابل نہ رہا تھا اس کی شرم نے اسے منوں مٹی تلے منہ چھپانے پہ مجبور کر دیا تھا اور میں۔۔۔ میں حقیقت کسی کو نہیں بتاؤں گی یہ میں نے طے کر لیا اور خدا تو ہے

ہی سب سے بڑا منصف۔۔۔ یقیناً یہ سب فیصلے مجھ سے وہی کروا رہا تھا۔

میں نے مٹی میں پڑی چادر اٹھائی اور وہاں سے نکل بھاگی اب تک کسی کی نظر مجھ پہ نہیں پڑی تھی۔ کوارٹروں کے پچھلی طرف تندور کے پاس سے گزرتے ہوئے حواس باختہ سی لائی کو میں نے موچے کی باڑھ پھلانگتے ہوئے دیکھا۔ وہ کبھی مردان خانے کے اس بیرونی حصے کی طرف نہیں گئی تھی لیکن حویلی میں بچے شور نے اسے ایسا کرنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ ”لائی۔۔۔ لائی۔۔۔ بہن۔۔۔“ قالے کے گھنے پودوں کے بیچ چھپ کے میں نے اسے آہستہ آہستہ آوازیں دیں۔ وہ چونک پڑی، بڑی سی کالی چادر ذرا سی سرکا کے اس نے اپنی وحشت زدہ نگاہیں ادھر ادھر دوڑا میں۔

”مومنہ۔۔۔ تم اور۔۔۔“ میں اس کا ہاتھ تھام کے گندم اور اناج والی کوٹھری میں لے آئی۔ اس کی سر اسیمہ حالت صاف بتا رہی تھی کہ فائر کی آواز اور ملازمین کے رونے پینے نے اس کی گتہ کن خدشات کو جگا دیا تھا۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں آنسوؤں سے بھری مجھ سے سوال کر رہی تھی۔

”کیا ہوا مومنہ؟ تمہارا لالہ وہ تو اور اندر تھا۔۔۔ کہاں ہے تمہارا لالہ۔۔۔ وہ ٹھیک ہے نا؟“ مجھ نے اس کی بھری بھری کلاسیاں، سرے سے بھری آنکھیں اور دندا سے سرخ لب دیکھے۔ میری ہمت نہ پڑی کہ میں اپنی زبان سے اسے سہاگن سے بیوہ ہونے کی منحوس خبر سناؤں۔

”مجھ سے کچھ نہ پوچھو لائی۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے ابھی اسی وقت یہاں سے جانا ہے اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ میں نے اپنے ننگے پیر اور خالی ہاتھ دکھاتے ہوئے کہا۔

”یہ مت سمجھنا میں اپنی جان بچا کے بھاگ رہی ہوں، وقت ملا تو ضرور تمہیں ساری بات بتاؤں گی فی الحال تو تم سے اپنے اور فیروز لالہ کے رشتے کے صدقے کچھ مانگ رہی ہوں۔“ وہ بڑی الجھن کا شکار تھی، کبھی میری بات سننے کی کوشش کرتی کبھی مڑ کے حجرے کے اس کمرے کو دیکھتی جہاں اتنے فاصلے سے بھی ہجوم بڑھتا دکھائی دے رہا تھا، اس کا سارا دھیان اسی طرف تھا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہاتھ سے طلائی کلنگ اتارنے کی کوشش کی۔

”یہ کیا کر رہی ہو؟“ وہ اور ہراساں ہو گئی۔

”لائی۔“ میں نے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

”میں نے کہا ناں بہن میں ایک انجانے سفر پر جا رہی ہوں مجھے زور راہ چاہیے۔ خدا

کا واسطہ ہے میری مدد کرو تمہیں لالہ کی قسم اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی نکلن اتارے۔ چادر کے پلو سے بندھے چند دس دس کے نوٹ نکالے، چل اتار کے میرے آگے کی اور میرے گلے لگ کے اونچی اونچی آواز میں رونے لگی، شاید اس کے اندر کسی نے اسے اجڑنے کا اشارہ دے دیا تھا۔ دوبارہ اس نے مجھ سے لالہ کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ میں نے اس سے رازداری کا وعدہ لیا اور وہاں سے فرار ہو گئی۔

اس وقت سارے علاقے کی توجہ حویلی پہ ہونے والے واقعے کی طرف تھی۔ میں بڑی آسانی سے سید و شریف سے نکل گئی۔ پشاور جانے کے بجائے میں نے پنڈی کا رخ کیا۔ وہاں زریاب کا خطرہ کم تھا۔ پھر..... پھر میں نے نجانے کیا سوچ کے لاہور کا ٹکٹ لے لیا۔ میں اس وقت بالکل اکیلی تھی۔ تنہا لاوارث، میرا کوئی نہ تھا۔ نہ دوست نہ کسی نہ پیر کے نیچے زمین اپنی تھی۔ ایسے میں لاہور جانا میں نے مناسب سمجھا، شاید وہاں کی انہی مجھے اپنی سی لگے۔ کہتے ہیں ہر انسان کی نسل باپ کے نام سے جاتی ہے، باپ کا حوالہ اس کی پہچان ہوتا ہے، میرا باپ یہیں کا تھا، اسی شہر میں میں میرے خون کے رشتے موجود تھے۔ بھلے وہ مجھے نہیں جانتے تھے، میں انہیں نہیں پہچانتی تھی لیکن وہ تھے تو سہی، اس شہر نے مجھے پناہ دی۔ لالہ کا دیا ہوا زیور کچھ دن میرے کام آیا۔ میرے دل میں اس کی جگہ پر بھی..... لیکن پھر زندہ رہنے کے لیے مجھے نوکری کرنا پڑی۔

دن ایسے ہی گزر جاتے اگر موت مجھے خود دہ نہ کر دیتی۔ مجھے مرنے سے ڈر نہیں لگتا تھا، مجھے لاوارث مرنے سے ڈر لگتا تھا۔ میں نے کوئی کچھ بچھڑا کر لیا تھا۔ میں چاہتی تھی کوئی اپنا بڑی محبت سے مجھ پہ مٹی ڈالے، بڑے دل سے میری مغفرت کی دعا کرے، اور قدرت نے مجھے میرے دوا اپنے ملوادیے۔ میرے لالہ کی آخری سانس میری اپنی بیٹی میری بیٹی..... جو مجھ سے اتنی متنفر ہے کہ..... لیکن اس کا کیا قصور میں نے کیا تھا؟ لیکن ماں ہونے کا فرض ادا نہیں کیا تھا۔ ایسا نہیں تھا مقدس کہ میں بھول گئی تھی۔ تمہیں..... لیکن میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ”وہ آس بھرے انداز میں سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی مقدس کو دیکھنے لگی۔

”میں اس واقعے کی بیٹی شاہد تھی۔ اگر کسی کو یہ پتا چل جاتا تو لازماً مجھے عدالتوں میں گھسیٹا جاتا اور مجھے خدشہ تھا کہ کٹھن کے میں کھڑے زریاب کو دیکھ کے میں کمزور نہ پڑ جاؤں۔ میں نے کہا تھا ناں تم سے کہ میں اپنے اندر کی محبت کی ماری عورت سے ڈرتی ہوں۔ مجھے لگ رہا تھا تمہیں دیکھ کے میرے قدم نہ لڑکھڑا جائیں۔ شاید تمہارے سر سے

باپ کا سایہ کھینچنے کی ہمت نہ ہو سکے۔ شاید زریاب کے چہرے پہ پھیلا کچھتاوا مجھے نرم کر دے۔ محبتیں کمزور بنا دیتی ہیں، سمجھوتا کرنا سکھاتی ہیں۔ عشق عیب ڈھک دیتا ہے۔ میں نہ کمزور پڑنا چاہتی تھی نہ نرم ہونا۔ مجھے سمجھوتا نہیں کرنا تھا، بدلہ لینا تھا میں نے محبت مار دی اور نفرت زندہ رہنے دی۔ میرے کانوں میں اس کے الفاظ کی بازگشت سنائی دیتی، میری انا کو کچھ کے لگتے۔

میرے رخسار کا داغ لودینے لگتا اور دل میں پھر سے تپش بھڑک جاتی۔ اس کی گالیوں کے چھینٹے نظر آتے تو میری روح انتقام سے لتھڑ جاتی۔

میں چاہتی تو عدالت میں اپنے داغ دکھا کے اور ساری سچائی بیان کر کے اسے پشیمانی میں کچھتاوے میں مبتلا کر سکتی تھی۔ سچائی کے آگے بی بی جان کے بودے الزام کتنی دیر قائم رہے لیکن اس سے کیا ہوتا، اس کے کہے الفاظ تو واپس نہ لوٹ جاتے، بے اعتباری کا داغ تو نہ مٹ سکتا۔ بے عزتی کا دکھ میری رگ رگ میں اتر چکا تھا۔ اب میری یادداشت ہی ساتھ چھوڑ دیتی تو میں کیسے سب بھلا سکتی تھی۔ لیکن میں کچھ نہ بھولی..... صرف اپنا عورت ہونا بھول گئی، بیوی ہونا، ماں ہونا بھول گئی، صرف زریاب کو سزا دینا یاد رہا۔

میں بھاگ گئی۔ مجھے کچھ گناہ ہی تھا اگر موجود رہتی تو جج بیان کرنا پڑتا اور شاید تب اسے اپنی عملی کا احساس ہو جاتا۔ وہ معافی مانگتا، کچھتا تا، روتا تو شاید..... مجھے اسے معاف بھی کرنا پڑ جاتا اور معافی اسے مطمئن کر دیتی۔ زریاب کو اطمینان مل جائے کیا یہی انصاف ہے؟ میں اسے عمر بھر جلتا دیکھنا چاہتی تھی چاہے اس کے لیے مجھے خود کو شعلوں پہ ہی کیوں نہ جلانا پڑتا۔

”خود کو؟“ مقدس کے سوال پہ اس نے گہری سانس بھری۔

”میں مانتی ہوں میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے ساتھ ساتھ تمہیں بھی ایک آخان میں ڈالا۔ لیکن میں پہلے بتا چکی ہوں کہ تمہیں تمہارے خاندان میں تمہارے اپنے لوگوں میں چھوڑتے ہوئے مجھے وہ فکر نہ تھی۔ اب میں کہاں جانتی تھی میرے نصیب کا کچھ حصہ تم بھی چرا لوگی۔ اجنبیت تمہاری کھلی بھی بنے گی اگر مجھے پتا ہوتا تو میں تمہیں کبھی اکیلا نہ چھوڑتی لیکن اتنی دور تک تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ میرے دل میں وہاں پہ تو اس وقت ایک ہی دھن سوار تھی

اب احساس ہو رہا ہے کہ اگر وقتی طور پہ زریاب کے ساتھ رہنے کے قابو میں نہ رہے تھے تو میں کب پورے ہوش و حواس میں رہی تھی۔ مقدس! میں اس کی تلافی کرنا چاہتی ہوں۔ میرا یہ اعتراف اس کا پہلا قدم ہے اور خوشنود تم اب جان گئے ہو گے کہ زریاب

تمہارے باپ کا قاتل نہیں ہے۔ اس نے خود اپنی جان لی تھی، حالات چاہے کیسے ہی رہے ہوں، ان کا ذمہ دار چاہے کوئی بھی ہو، بہر حال اسے خودکشی ہی کہیں گے۔“

”آج آپ یہ کہہ رہی ہیں اور کیوں کہہ رہی ہیں، میں جان گیا ہوں۔“ اس نے کن انکھیوں سے مقدس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن پھوپھو جان، میں تو آپ کی نظروں سے دیکھ رہا ہوں اور آپ نے ہی کہا تھا کہ میری نظر سے دیکھو وہ کتنے لوگوں کا قاتل ہے۔“

”اسے اس کی سزا بھی تو مل رہی ہے، قید میں بھی اور قید سے باہر بھی ایک مسلسل سزا اس کے تعاقب میں ہے ایک پچھتاؤں سے بھری اجڑی ہوئی زندگی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ تم اس کی باقی سزائیں قدرت کے لیے چھوڑ دو اور اپنے اس خوبصورت دل کو صاف

شفاف کر لو بالکل اپنے باپ کی طرح، بنا کسی نفرت کے، بنا کسی کینہ و حسد کے۔“

”میں کسی سے نفرت نہیں کرتا۔“ اس نے اٹھ کے گلاس وینڈو تک جاتی مقدس کو دیکھا اور اپنی شکست کا اظہار کیا۔

”لیکن محبت..... اس کے لیے ابھی دل اتنا صاف نہیں ہوا کہ.....“ مومنہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تم مقدس کو بھی میری نظر سے دیکھو۔ میری نظر سے دیکھو کہ وہ دنیا کی نیکی ہے، یہ بھول جاؤ گے۔“ اس نے خوشنود کا مضبوط ہاتھ دباتے ہوئے اصرار کیا۔ اس کے کہنے پہ اس نے نظر اٹھائی۔ کمرے کے اس گوشے میں موجود مقدس شیشے سے پرے

تاریک میدان کو دیکھ رہی تھی۔ رات کے سائے گہرے ہو چکے تھے اور باہر موجود سنسان لان میں جلتے اکا دکا بلب کے ٹمٹماتے عکس شیشے پہ نمایاں ہو رہے تھے۔ ان جلتے بجتے

سایوں کے ساتھ مقدس کا چہرہ آج بھی اسے اتنا ہی روشن اتنا ہی منور لگ رہا تھا جتنا کہ پہلے۔

اول محسوس ہوا تھا۔ اس کی خلا میں بھٹکتی آنکھوں کے نیلگوں آئینے رات کے اس سے سیاہی مائل سے لگ رہے تھے اور موی انگلیاں بے دھیانی میں دیوار پہ نہ جانے کیا لکھ رہی تھیں۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ دھند چھپتی رہی..... وہ اسے دیکھتا رہا اور گرد صاف ہوتی

رہی..... وہ اسے دیکھتا رہا اور روشنیاں دل میں اُترتی گئیں۔

”میرا دل..... ہاں میرا دل شفاف ہے۔“ اسے احساس ہوا تو اعتراف کرنے مڑا، مومنہ کی آنکھ لگ چکی تھی۔ دواؤں کے زیر اثر اس کے اعصاب اس کے کنٹرول سے باہر

تھے۔ یہ محض اس کی اپنی قوت ارادی تھی جو وہ نہ صرف اتنی اتنی دیر عالم ہوش میں رہ جاتی

تھی بلکہ یادداشت کی زنجیر سے برسوں پرانے واقعات بھی ڈھونڈ لاتی تھی۔ اس نے کبیل درست کر کے اوڑھایا اور چپکے سے مقدس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ دیوار پہ حرکت کرتی اس کی انگلیوں پہ غور کیا وہ بے دھیانی میں ماں لکھتی چلی جا رہی تھیں۔

”ماں.....!“ اس نے سرگوشی کی تو وہ چونک کے مڑی۔ خوشنود نے اسے انگلیاں

مسل کے مٹھی بھینچتے ہوئے دیکھا۔

”سزائیں دینے کا یہ عمل کب تک جاری رہے گا مقدس، کیا سزا اور سزا ہمارے نصیبوں میں لکھ دی گئی ہے۔ کسی نے اپنی محرومیوں کی سزا ایک گلاب چہرہ چھلکا کے دی۔

کسی نے اپنی عزت پہ حرف آتے دیکھ کے ایک باوقار شخص کو اذیت ناک موت کی سزا دی، کسی نے انتقام کے جذبے سے مغلوب ہو کے ایک جذباتی شخص کو اس کے جرم سے بڑھ

کے سزا دی اور تم..... تم مقدس اس ماں کو کیوں سزا دے رہی ہو اسے ماں نہ تسلیم کر کے۔ جاؤ بھلا زندہ ہی شاید صرف اس لیے ہے کہ تم ایک بار تمام شکوے بھلا کے ان کے گلے لگ جاؤ ورنہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مجھے ان کی حالت دیکھتے ہوئے زندہ

رہنے کی اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

مقدس ان کی سزا میں آسان کر دو۔ اس وقت تو اجنبیت کے بجائے اپنائیت کی غمش مٹی چاہیے انہیں۔

وہ رو پڑی..... سسک سسک کی رو پڑی۔

”رولو مقدس تم مجھ کے رولو..... کبھی کبھی دھندلیوں بھی چھپتی ہے، کبھی کبھی گردیوں بھی صاف ہوتی ہے، میں مرد ہوں، رو نہیں سکتا، جانتی ہو میں نے اپنے دل کا آئینہ شفاف

کیا کیا۔“ اس کے سوالیہ انداز میں دیکھنے پہ وہ اس کی گہری آنکھوں میں بھر پور انداز سے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ کئی روز کے تناؤ کے بعد اس کے تھکے تھکے چہرے پہ یہ مسکراہٹ

مقدس کو بڑی نکھری ہوئی لگی۔

”میں نے تمہیں دیکھا اور دھند چھٹ گئی۔“

”دراب، بچیوں کو اطلاع بھجوائی؟“ افراسیاب خٹک نے پچھلے ایک گھنٹے میں کوئی چوتھی بار دریافت کیا اور نفی میں جواب ملنے پہ جھنجھلا گئے۔

”میں کیا کر سکتا ہوں لالہ؟ ہاسٹل سے یہی جواب ملتا ہے کہ وہ دودن سے نہیں آئی البتہ کل اس نے فون پہ انتظامیہ سے بات کر کے مزید دودن کی غیر حاضری کی اجازت لے لی ہے۔“

”اور شناور؟“

”اس کے ہاسٹل بھی فون کیا ہے وہ اس وقت وہاں موجود نہیں“

”اتنی صبح صبح تو کالج بھی نہیں کھلتا وہ کہاں چلی گئی۔“ اس سوال کا جواب تو دراب کے پاس بھی نہیں تھا۔ رات کے پہلے پہر باچا جان کی وفات ہوئی تھی، اس وقت انہوں نے گریز ہاسٹل فون کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ رات سے ہی برادری کے لوگوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق باچا جان کو زیادہ دیر تک رکھا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اور صبح فجر سے لے کر اب تک وہ لاہور میں مقدس اور شناور سے رابطہ کرنے میں ناکام رہے تھے۔ آخر کار افراسیاب خٹک نے فیصلہ سنا دیا۔

”رابطہ کی کوشش جاری رکھو۔ انہیں آج ہی اطلاع ملنا تو لازمی ہے البتہ انتظار میں باچا جان..... میرا مطلب ہے اب ان کی روانگی کا انتظام کیا جاتا ہے۔“

زریاب اور بی بی جان دونوں صدمے سے غمگین اس ساراے مسئلے سے بے خبر تھے۔ بیس سال کی قید میں ایک ساکت و جامد زندگی گزارنے کے بعد زریاب کے لیے رہائی کے فوراً بعد ملنے والے بے درپے جھٹکے شدید ثابت ہوئے تھے اس کا دھیان ہی اس طرف نہیں گیا البتہ چھینرو تکلیفیں کے بعد بی بی جان ذرا جھٹک کر رہ گئیں۔

”کسی نے لاہور اطلاع نہیں بھجوائی بچیوں کو؟“

زریاب بھی چونکا اور دراب کے تفصیلی جواب نے دونوں کو نئی فکر میں ڈال دیا۔

”کہاں جاسکتی ہے مقدس دو چار دن کے لیے لے لیا تو کبھی نہیں ہوا اور شناور وہ تو کالج سے چار بجے تک آ جاتی ہے میں عموماً اسی وقت اسے فون کیا کرتی ہوں پھر اب شام کے سات بجنے والے ہیں اور وہ ابھی غائب ہے۔“ بی بی جان بڑبڑاتی تھیں۔

”اور کالج بھی نہیں گئی ہے وہ آج۔ یہ بھی پتا چلا ہے۔“ دراب نے کہا۔

”کہاں جاسکتی ہیں دونوں بغیر بتائے۔“ وہ کہہ رہی تھیں۔

زریاب مضطرب سا ہو کے ٹھٹھنے لگا۔ بڑی دیر سے ہاتھ مسل کے کچھ کہنے کی ہمت مجتمع کرتی ہوئی زبیدہ بیگم فیصلہ کن انداز میں اٹھیں۔

”وہ دراصل میرے پاس..... میرے پاس شناور کا موبائل نمبر ہے۔“

”موبائل نمبر؟ اس نے موبائل فون کب سے رکھنا شروع کر دیا۔“ دراب نے ماتھے پر ہل ڈال کے پوچھا۔ اس کی اپنی ایک مخصوص سوچ تھی جس پر بیرون ملک کی تعلیم اور طویل قیام بھی اثر نہ ڈال سکا تھا اور حقیقت میں شناور اپنے اس چھوٹے ماموں سے خائف ہو کے ہی موبائل فون سب سے چھپا کے رکھنے پر مجبور ہوئی تھی کہ یہ اس کی ضرورت تھی۔

”اوہو یہ وقت اس بحث کا نہیں۔ تم جلدی سے اسے کال کرو۔“ افراسیاب نے

معاملہ ختم کیا۔

ہال کمرے میں بھی چاندنیوں پہ، کافور اور اگر بیٹوں کی مہک کے ساتھ وہ تمام لوگ اس وقت تکلیف باندھے فون پہ بات کرتی زبیدہ کو دیکھ رہے تھے۔

”اس وقت اطلاع کرو دیتے لیکن تم دونوں اپنے اپنے ہاسٹل میں تھیں ہی کب؟“

شناور نے باچا جان کی وفات کی خبر سنتے ہی جو سوال کیا تھا، وہ اس کا جواب دے رہی تھیں۔ ”اچھا بیٹا صبر کرو، دعا کرو اپنے باچا جان کے لیے، اس طرح رونے سے وہ واپس تو نہ لوٹ آئیں گے۔ شاباش چپ ہو جاؤ اور مقدس کا بتاؤ وہ کہاں ہے..... کیوں غائب

تھے اپنے دنوں سے ہاسٹل سے اس کی غیر حاضری کا سن کے سب ہی فکر مند ہیں۔“ اسے چپ کرانے کراتے انہوں نے پوچھا اور جواب میں جانے اس نے کیا کہا تھا کہ وہ حیرت کی زیادتی سے صدمے سے اچھل کے کھڑی ہو گئیں۔

”کیا کہا تم نے..... کبھی ماں کے پاس؟“

”کب؟ کیسے؟“

”کہاں ملی تھیں؟“

”سب لوگ اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کے قریب چلے آئے ماسوائے زریاب کے۔ وہ وہیں بیٹھا خود کو ایک نئی خبر کے لیے تیار کرنے لگا۔ زبیدہ نے فون کریڈل پر رکھا اپنی حیرت سے بھری نظریں سب پر دوڑائیں۔“

”مومن..... زریاب کی بیوی مل گئی..... مقدس اسی کے پاس ہے۔“ ان کے لہجے میں ابھی تک بے یقینی تھی۔

”وہ شناور یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اس کی حالت بہت نازک ہے۔ ہاسٹل میں ایڈمٹ ہے مقدس بھی اسی وجہ سے ہاسٹل سے غیر حاضر ہے۔“ انہوں نے مزید بتایا کسی نے کوئی تبصرہ نہ کیا سب کی نگاہیں زریاب کے چہرے پہ جمی تھیں، جہاں اس وقت زلزلے کے آثار نمایاں تھے۔ بی بی جان نے آگے بڑھنے کی ہمت کی۔

”زر، میرے بچے یہی وقت ہے، اس وقت کو روک لو ورنہ پھر کچھ باقی نہ بچے گا، عمر بھر کے پچھتاوے کے سوا۔ خدا اسے زندگی دے، اتنی کہ ہم لوگ اس کے ساتھ کی گئی

زیادتیوں کی تلافی تو کر سکیں اور کچھ نہیں تو اس سے معافی تو مانگ سکیں۔ اٹھو زر، جاؤ اس کے پاس..... قسمت سے یہ موقع ملا ہے، اسے کھونا مت۔“

”لیکن بی بی جان میں کیسے؟“ اس نے گھر کے افسردہ ماتمی ماحول پہ اک نظر ڈالی۔ ”ابھی صبح باچا جان کی تدفین ہوئی ہے، گھر لوگوں سے بھرا پڑا ہے، کل ان کے قل ہیں اور میں یہاں سے چلا جاؤں“

”جانے والے تو چلے گئے زریاب۔“ افراسیاب نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔ ”جو چاہے ہیں انہیں روک لو۔ اسے تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔ سوچنے میں وقت ضائع مت کرو اور جانے کی تیاری کرو۔“ ☆☆☆

ننگے پندے مینوں چمکاں مارے

تے میرے روندے نیں نین نمائے

جنیاں تن میرے تے لکیاں

تینوں اک لگے تے توں چلے

غلام فریدا دل اوچھے دیئے

جتنے اگلا قدر وکی جانے

(جتنی میرے تن پہ لگی ہیں تمہیں ایک بھی لگے چلے۔ غلام فرید دل اسے دینا چاہیے جو اس کی قدر بھی جانے)

نیم بے ہوشی کے عالم میں اسے اپنے ابا کی درد منی ڈوبی آواز سنائی دی۔

یہ گیت..... یہ گیت ابا نے کتنی بار اسے سنایا تھا اور وہ بغیر مطلب جانے سمجھے، خود بھی

درد کے اک گہرے سمندر میں بہنے لگتی تھی پھر کتنے دنوں بعد جب زریاب سے اس گیت کا

مطلب سمجھا تب بھی دکھ کی ہلکی ہلکی سی کہر نے اسے ڈھانپنا چاہا لیکن اس نے جھٹک کے

اس دکھ بھرے احساس کو پرے کر دیا ان دنوں تو وہ صرف خوش رہنا چاہتی تھی اور بچھڑاؤ اس

کہر نے اس کے گرد اپنا جال بنا شروع کر دیا، اسے ہر طرف سے غم کی دھند میں لپیٹ دیا

تب اس گیت کے بولوں نے نئے نئے راز کھولے۔ آج ابا کی آواز اسے اوپری اوپری سی

نہ لگ رہی تھی۔ آج اس کا ہر لفظ اس کے دل میں اتر رہا تھا۔

”ابا!“ اس کے لبوں سے کراہی نکلی اور پھر سے ذہن بے ہوشی کی وادیوں میں کھو گیا۔

اسے میرے محبوب!

میری آنکھیں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔

لوٹ آؤ۔

میں تمہاری تسکین اپنے ہاتھوں میں سمولوں۔

ماں کی آواز میں ”برہ“ اسے سنائی دیا۔ ”ماں..... ماں!“ اس نے ذہن کے گٹھا ٹوپ اندھیرے میں ہاتھ مارتے ہوئے ماں کو تلاش کرنا چاہا۔ اس کی ”کوٹھی“ پہ لگی سپیاں کھٹک اٹھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے ماں کے ”پوشش“ کا دامن تھامنا چاہا۔

”ابھی نہیں میری لاڈلی، بس کچھ دیر اور.....“ ابا نے بھی نگاہوں ہی نگاہوں میں تسلی دی۔ ☆☆☆

”ماموں!“ وہ دیئے ہوئے پتے پہ پہنچنے کے کچھ دیر کے لیے رکا۔ سر اٹھا کے اس سفید

عمارت کو دیکھ رہا تھا جس کے اندر ”وہ“ موجود تھی جب ایک اشتیاق بھری آواز پہ پلٹا۔ سبز

کاٹن کے مسلے ہوئے سلوٹوں سے بھرے لباس میں ملبوس وہ کم عمری لڑکی اپنے سنہری

چہرے پہ بے پناہ اشتیاق لیے اس سے ہی مخاطب تھی۔

”مقدس؟“ اس نے سوچنا چاہا لیکن اس کی زردی مائل سبز آنکھوں کو دیکھ

کے خود ہی تردید کی گئی تھی تو کسی اور کی یاد دلارہی تھیں۔ رحیم گل آفریدی کی.....

وہ چونکا۔ ”ماموں!“ اب کے اس نے پورے دھیان سے اسے سنا اور اثبات میں سر ہلاتے

ہوئے اپنے بازو پھیلا دیئے۔

”وہ اچھے ہیں۔ دونوں۔“ اس کے سینے سے لگتے ہوئے اس نے سرگوشی کی۔

زریاب کا درواں دونوں روتے لگا۔

”بس کچھ دیر اور.....“ چہرے میں بعد..... وہ دونوں میرے سامنے ہوں گی۔“ اس کا

دل یہ سوچتے ہی اچھل اچھل اٹھا۔ یہ چند قدموں کا فاصلہ ایک ہی قدم میں طے کرنے پر

اس کے دل کا اور بے چین بننے کا ایک ہی قدم کا فاصلہ رہ گیا تو وہ رک گیا۔

”ابا جان“ اس نے زریاب کے پھلے بازو دیکھے تو الجھ سی گئی۔ ذہن میں کہیں خوشنود

کے الفاظ نے سہارا دیا۔

”سزا نہیں دینے کا یہ عمل کب تک جاری رہے گا۔“ اس نے باپ کی پیاسی آغوش

میں جانے میں دیر نہ لگائی۔ ماں کی ممتا کو تسکین پہچانے میں اس نے جو ہچکچاہٹ کا مظاہرہ

کیا تھا، اس کا خمیازہ وہ ایک کک کی صورت بھگت رہی تھی۔ اس وقت اس کی ماں زندگی

کی آخری بازی کھیل رہی تھی۔ اور وہ باہر کھڑی اللہ سے بس ایک لمحہ مانگ رہی تھی۔ بس

ایک لمحہ جس میں وہ ماں کو جاتے جاتے اپنی محبت کا یقین دلا جائے۔ اندر خوشنود ڈاکٹر محمود کے ساتھ مل کے وہ ایک لمحہ بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مومنہ کی بے ہوشی طویل ہو چکی تھی۔

”میں ایک بار اپنے سر پر باپ کے ہاتھ کا سایہ محسوس کرنا چاہتی ہوں۔ میں جانا چاہتی ہوں وہ ٹھنڈک کیسی ہوگی جو ان ہاتھوں تلے پھیلی چھاؤں میں ہے۔“

کچھ ہی روز قبل فجر کی نماز میں کی گئی دعا کے الفاظ اس کے چاروں طرف گونجنے لگے۔ سر پر رکھی زریاب خٹک کی ہتھیلی سے ٹھنڈک اس کی پوری پوری اترنے لگی۔ اسے اپنی دعا کے پورا ہونے کا یقین ہو گیا۔ وہ ایمان لے آئی کہ اس دعا کا دوسرا حصہ بھی ضرور پورا ہوگا۔

اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے باپ کے خدو خال میں وہ عکس ڈھونڈنے چاہے۔ بچپن سے گھر میں لگی قد آدم تصاویر میں دھتکتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے چہرہ پر اسے پہلے لٹنے کا غم نمایاں تھا۔ چہرے پہ پچھتاؤں کی گہری لکیریں تھیں۔ بھڑور کی آنکھوں کے گرد جلتے تھے اور چوڑے شانے ڈھلکے ہوئے تھے۔

”مما تمہیں خزاؤں کے حوالے کر کے باپ بھی اجڑے ہی رہے ہیں۔“

”مقدس!“ کمرے سے نرس کے ہمراہ کھتے ڈاکٹر خوشنود نے آواز دی۔

”فیروز!“ زریاب کو ایک اور جھٹکا لگا اور وہ بے ہوشی سے اس فوجی کو دیکھنے لگا۔

”بھوپھی جان، ہوش میں آ گئی ہیں۔“ مومنہ نے اس کی ہاتھوں کی بات نہیں کی جاسکتی، تم چاہو تو ان سے مل سکتی ہو۔“ اسے ایک دراز قامت مگر تھکے تھکے انسان کا ہاتھ تھام کے اندر جاتے دیکھ کر اس نے روکا۔

”تم اکیلی ان سے مل سکتی ہو مقدس۔ میں نے کہا تھا ان کی حالت بہت نازک ہے۔“ وہ کچھ کچھ پہچان رہا تھا۔

”بابا جان!“ اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہنا چاہا۔ جواباً زریاب نے ایک سرد آہ بھری۔

”کیا میرے نصیب میں پچھتاؤں سے رہائی نہیں لکھی۔ مقدس..... میری بیٹی اپنی ماں سے مجھے معافی دلا دو۔“ وہ ہاتھ جوڑ کے تقریباً ہلکے اٹھا۔

”میں تو مر بھی نہیں سکوں گا اگر اس نے مجھے معاف نہ کیا۔“

مومنہ کی آتی جاتی اکھڑی سانسیں دیکھ کے مقدس تڑپ گئی۔ اس نے ماں کے برف ہوتے پیر تھام لیے۔

”مما.....“ مومنہ نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھوں کے دھندلے

ہوتے شیشوں پہ مسکراہٹ کا عکس جھلکایا۔ خوشی کی چمک نے اس کے زرد چہرے کو یکا یک جگمگا دیا۔ اس کے لبوں نے پھڑپھڑا کے اسے پکارنا چاہا لیکن وہ وہیں دوڑا تو بیٹھ کے اس کے پیر چومنے لگی۔

”میری پیاری ممما..... میری ممما مجھے معاف کر دیں مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کو کتنا دکھ دیا۔ آپ بائیس پھیلا پھیلا کے مجھے بلاتی رہیں اور میں بے ثمر حسابوں میں کھوئی رہی..... میں کتنی بد نصیب ہوں ماں کے ملنے کے بعد بھی اس کی قدر نہ کی۔“

اس کے آنسوؤں نے مومنہ کے پیر بھگود دیے۔ وہ بولنے کی سکت نہ رکھتی تھی۔ بدقت

ہاتھ اٹھا کے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ یوں بچکی کی طرح اس کے بازوؤں میں گئی جیسے اس کی حفاظت کا ایک پل بھی ضائع نہ کرنا چاہتی ہو۔ مومنہ نے کپکپاتے ہاتھوں میں اس کا جھکا چہرہ تھام لیا۔ لبوں سے اس کے ماتھے پہ ایک دعا ثبت کر دی۔

”میں جانتا تھا کہ میں کپکپاتے لبوں کا وہ بوسہ کتنا حیات بخش ہوتا ہوگا جو اولاد کے ماتھے کا مقدر بنتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ میں وہ گرمی کتنی پرسکون ہوگی جو ماں کی بانہوں کی پناہ میں ہے۔“

آج اس کی دعا کا یہ آخری حصہ بھی پورا ہو گیا تھا۔ اسے اپنی دعا کا وہ آخری جملہ یاد تھا۔ ”بس تھوڑی سی چھائی..... یا اللہ ذرا سی گرمی۔ بس اک بوسہ..... یا اللہ بس اک دعا۔“ وہ کانپ گئی۔

”کیوں میں نے نہیں ایک دعا کی طلب کی؟ کیوں میں نے بس ایک بوسے کی، ذرا سی گرمی کی خواہش کی۔“

”بس، بس..... بس ایک بوسہ تو نہیں۔“ وہ خوفزدہ ہو کے ماں کو پکارنے لگی۔

”مما..... ممما آنکھیں کھولیں آپ نے پھر سے آنکھیں کیوں بند کر لیں۔ دیکھیں

مما باہر کون آیا ہے..... بابا جان آئے ہیں آپ کے پاس خود چل کے آئے ہیں اپنی تمام غلطیوں کا اعتراف کرنے..... آپ کی ہر بات کی سچائی پہ ایمان لانے کے لیے.....

آنکھیں ممما..... پلیز ان سے مل لیں۔ ایک بار مل لیں وہ شرمندہ ہیں، ہارے ہوئے ہیں، انہیں اپنی زیادتیوں کا احساس ہو گیا ہے۔ آپ بھی ان کی سزا معاف کر دیں ممما۔“

”مما خدا کے لیے..... میری خاطر اب تو اپنے دل کو نرم کر لیجئے۔ معاف کر دیں انہیں۔ خدا بھی بڑی سے بڑی خطا معاف کر دیتا ہے اور معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ انہیں آپ کی پاکیزگی کا یقین ہے۔ آپ کو اور کیا چاہیے۔ بس کریں اپنے دل کو

جلانا..... بس کریں یہ نفرت کا کھیل، نکال پھینکیں اپنے دل سے یہ کالے پھول.....“ اس

کے مسلسل اصرار پر مومنہ نے ہار مان لی۔ اس کے لبوں پر ایک بے بس خاموشی تھی۔
 ”مومنہ!“ زریاب نے پکارا۔ اس کے چہرے کے بدلے نقوش دیکھ کے اس کے
 دل پہ گھونسا پڑا۔ پچھلے دنوں میں اس نے بڑی سے بڑی اندوہناک خبر سنی تھی کئی حادثے
 جمیل لیے تھے لیکن..... لیکن اس گلابی ریشمی چہرے کی جگہ ادھ جلا سا نولا پڑتا زرد چہرہ
 دیکھ کے اس کے دل پہ جو قیامت گزری تھی وہ سب سے اذیت ناک تھی۔

”اور کیا ان اندھیرے درپچوں کے پیچھے اب بھی شہر کی جمیل آباد ہے۔“
 مومنہ ایک بار تم نے پوچھا تھا۔ پھولوں کے رنگ کا لے کیسے ہو جاتے ہیں۔ میں
 صحیح طرح بتانہ پایا تھا، شاید شب میں جانتا ہی نہیں تھا۔ آج میں تمہارے سوال کا جواب
 دینے کے قابل ہوں۔ سنو مومنہ، پھولوں کے رنگ کا لے نہیں ہوتے۔ پھول بھی کالے
 نہیں ہوتے، کالک تو دلوں میں دی جاتی ہے، سیاق تو میرے دل میں اتر جاتی ہے۔ اندھیرے
 تو نظروں پہ چھا جاتے ہیں، اتنی تاریکی میں جو بھی دیکھو کالا ہی لگتا ہے۔ ایسے ہی
 اندھیرے میں چٹ کی چاٹ گئے تھے۔ میرے دل پہ عقل یہ شعور یہ ہر جگہ سیاہی مل دی گئی
 اسی لیے مجھے تمہارا دامن کالا نظر آیا۔ لیکن تم میلی کیسے ہو سکتی تھیں۔ پھول بھی کالے نہیں
 ہوتے۔ کالے نہیں ہوتے۔“ وہ جھجک کر اسے بتا رہی تھی۔ اس نے اس کے وجود
 میں اس کی رائی کو جان لینے کی خواہش کی تھی۔

مومنہ..... مومنہ وہ وحشت زدہ سا چلا اٹھا۔ مقدس اور خوشنود اس کی آواز کی
 گونج سے چونک کر اندر کی طرف لپکے۔
 ”مومنہ! تم ایسے نہیں جاسکتیں۔ تم مجھے معاف کیے بغیر کیسے جا سکتی ہو۔ تم مجھے اتنی
 لمبی سزا کیسے سنا سکتی ہو۔ تم اتنی پھر دل کیسے ہو سکتی ہو مومنہ، مومنہ! تمہیں خدا کا واسطہ لوٹ
 آؤ۔ مجھے اس قید سے نجات دلا دو۔ اس سنگباری کو روکو۔“

وہ گر پڑا تھا اور اس کے بے جان وجود سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ مقدس نے
 آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ آگے بڑھ کے ماں کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا۔

”تمہارے اندر کی عورت جیت گئی ماں، تم مر گئیں، لیکن تم نے اپنی نفرت مرنے نہ
 دی۔ شاید یہی نفرت تمہاری زندگی تھی لیکن میں جانتی ہوں تم بزدل تھیں۔ تم خود کو جتنا
 مرضی کشور ثابت کر لو تم ایک بزدل عورت تھیں۔ اس بزدلی نے تمہیں مرنے پہ مجبور کیا۔
 اگر زندہ رہتیں تو نفرت مرنے جاتی۔ ہے ناں ماں؟ کچ بچتا تو تمہاری نفرت مرنے لگی تھی

ناں؟“

ختم شد